اُردو شاعری
میں
مُغل سلطنت کے زوال کی عکاسی

مصنّفہ
ڈاکٹر شہناز بیگم

اُردو شاعری
میں
مُغل سَلطنت کے زَوال کی عکّاسی

ڈاکٹر شہناز بیگم

سنہ اشاعت : ۲۰۰۴ء

تعداد : ۴۰۰

ناشر : ڈاکٹر شہناز بیگم

۳۲۳۴، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

قیمت : ۱۵۰/- روپے

طباعت : جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

Urdu Shairi Mein Mughal Saltanat Ke Zawal ki Akkasi

By : Dr. Shahnaz Begum (Ph. : 23214303)

Price : Rs. 150/-

Ist Edition : 2004

یہ کتاب اُردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)، اُردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

انتساب

اپنے مشفق والدین اور اساتذہ کے نام
جن کی شفقتوں کی بدولت یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

فہرست ابواب

حرفِ آغاز

ڈاکٹر شہناز بیگم تاریخ کی طالب علم ہیں۔انھوں نے حال ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ وثقافت سے ''اردو میں تاریخ نگاری کی تاریخ' ابتداء اور ارتقاء: اٹھارویں صدی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مجھے یہ تحقیقی مقالہ تفصیل کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔اس لیے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے موضوع پر اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ ہے۔

اس وقت ان کی کتاب ''اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی'' میرے پیشِ نظر ہے۔اس کتاب کے مسودے کا میں نے تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو ادب پر ڈاکٹر شہناز بیگم کی گہری نظر ہے اور اردو زبان پر بھی انھیں اچھی قدرت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور اس طرح ایک اعلا درجے کا کام ہمارے سامنے آیا ہے۔ان کا کام اس معیار کا ہے کہ اگر وہ اس کتاب کی ضخامت تھوڑی اور بڑھا دیتیں تو اس پر بھی ہندستان کی کسی بھی یونیورسٹی سے انھیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری مل سکتی تھی۔

یوں تو ہندستان میں بہت سے حکمراں خاندانوں کو عروج حاصل رہا اور پھر وہ زوال کے اندھیروں میں اوجھل ہو گئے لیکن تاریخ کے صفحات پر صرف اُن کا نام اور ان کے دورِ حکومت کے کچھ اہم واقعات باقی رہ گئے۔تاہم خاندان مغلیہ کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔مغلوں کا زوال صرف ایک حکمراں خاندان ہی کا زوال نہیں پوری ایک تہذیب کا زوال تھا۔اکبر کے عہد میں یہ تہذیب اپنے عروج پر تھی۔اس تہذیب کے خدوخال مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر شاہ کے ہاتھوں بننے شروع ہوئے۔اورنگ زیب کے عہد تک یہ تہذیب اپنے عروج پر رہی۔اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا اور بالآخر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ساتھ اس کا دور ختم ہوا۔

ایک عام مورخ صرف بادشاہوں اور بادشاہوں سے متعلق لوگوں کے واقعات اور

حکومت کے عروج و زوال کے حالات ہی بیان کرتا ہے۔ وہ اس عہد کے عام لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر شہناز بیگم نے تاریخ کے ایک صاحبِ نظر طالب علم کی حیثیت سے اٹھارویں صدی کے سیاسی حالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اورنگ زیب سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک وہ کون سے عوامل تھے جو ایسی عظیم الشان مغل حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ انھوں نے اورنگ زیب کے بعد کے بادشاہوں کی بے بسی اور دہلی پر نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے پے در پے حملوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کس طرح زوال کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور بالآخر شاہ عالم ثانی کے عہد تک پہنچتے پہنچتے مغل بادشاہ محض انگریزوں کے پنشن خوار ہو کر رہ گئے۔

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے نصف اوّل کی اردو شاعری میں غزلوں، مثنویوں اور خاص طور پر شہر آشوبوں اور ہجووں میں ان واقعات کی دردانگیز عکاسی کی گئی ہے، جن کا شکار اس دور کے خواص اور عوام دونوں ہی تھے۔ ڈاکٹر شہناز بیگم نے ان ادبی ماخذ کو سامنے رکھتے ہوئے اسی دورِ زوال کا تجزیہ بڑے اچھے ڈھنگ سے کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ صرف شاعری ہی نہیں مغلوں کے زوال کی ایک اہم ترین دستاویز بھی ہے۔

ڈاکٹر شہناز بیگم نے میر جعفر زٹلی سے لے کر سودا، حاتم، میر تقی میر، مصحفی۔ راغب، راسخ اور دوسرے شاعروں کے ایسے اشعار کے حوالے دیے ہیں، جن میں مغل دور کے زوال کی وہ داستان جو عام طور پر تاریخ کے صفحات میں ہمیں نہیں ملتی۔ انھوں نے یہ کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے جس کے لیے وہ یقیناً لائقِ مبارک باد ہیں۔

اس مقالے میں اُنھوں نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے بھرپور کام لیا ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو ہندستان کی تاریخ کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بن گئی ہے۔ اگر ڈاکٹر شہناز بیگم کی کتاب انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر سامنے آئے تو ہمارے غیر اردو داں مورخین کے لیے ایک اہم ماخذ کا کام دے گی۔

(ڈاکٹر خلیق انجم)

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

پیش لفظ

اس کتاب میں اُردو شاعری بالخصوص شہر آشوب کے حوالے سے مغل حکومت کے زوال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ زوال کی انتہائی عبرت ناک زبوں حالی کی تفصیل اُردو شاعری اور خاص طور سے شہر آشوبوں میں ملتی ہے۔ ان شہر آشوبوں میں بعض چشم دید تاریخی واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً شاہ عالم ثانی نے مراہٹوں کے ساتھ مل کر سکھر تال (روہیلکھنڈ) پر حملہ کر کے ضابطہ خاں روہیلہ کو شکست دی تھی۔ اس حملے کی تفصیل قائم چاند پوری نے ایک شہر آشوب میں بیان کی ہے۔ اس طرح اس عہد کے شعراء نے شاعری میں اپنے عہد کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کی تاریخ کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے۔ ان سے نہ صرف تاریخی واقعات کی توثیق ہوتی ہے بلکہ عوام کے ردعمل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کس طرح مغل حکمراں زوال کا شکار ہوئے، اور ہندوستانی معاشرے کے مختلف شعبوں میں زوال کے اثرات کس طرح مرتب ہوئے نیز یہ کہ دلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے کیا اثرات پڑے وغیرہ واقعات کا ذکر اُردو شاعری میں ملتا ہے۔

اس طرح اٹھارویں صدی کے مطالعے کے لئے میر جعفر زٹلی، محمد شاکر ناجی، مرزا محمد رفیع سودا، شیخ ظہور الدین حاتم، قیام اُلدین قائم چاند پوری، جعفر علی حسرت، میر تقی میر، شیخ غلام علی راسخ، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، محمد جعفر خاں راغب وغیرہ شعراء کے شہر آشوبوں اور ہجویات کا مطالعہ ضروری ہے۔ شہر آشوب کے علاوہ غزل، مثنوی جیسی اصناف سخن کا بھی بطور ماخذ

استعمال کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری اور اس کی تکمیل میں متعدد اہلِ علم کا تعاون رہا ہے۔ ان سب کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں۔ البتہ وہ افراد جن کی سرپرستی میں یہ کام ہر قسم کے مساعد و نا مساعد حالات میں آگے بڑھتا رہا۔ ان کی میں بے حد ممنون ہوں۔ ان میں ڈاکٹر نشاط منظر صاحبہ، پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین اور ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری (شعبۂ تاریخ دہلی یونیورسٹی) کی بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب اور اس کی تکمیل کے ہر مرحلے تک میری ہر ممکن مدد کی۔ اور ایسے تمام تاریخی ماخذ سے متعلق رہنمائی کی جن سے اہم نکتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

مقالے کی ترتیب کے دوران جن اہم شخصیتوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ان میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب (سیکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی) اور ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کی بطورِ خاص ممنون ہوں۔ جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مجھے ہمیشہ اپنا قیمتی وقت دیا۔ اور جن کی توجہ اور جن کے توسط سے تحقیق کی متعدد مشکلیں آسان ہوئیں۔ میں صمیم قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ان حضرات کے علاوہ جناب شریف الحسن نقوی صاحب (سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب جیسے بزرگوں کے تجربے بھی میرے کام آئے۔

اپنے اساتذہ کرام میں پروفیسر سید عنایت علی زیدی صاحب (صدر شعبۂ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی بطور خاص سپاس گذار ہوں۔ جنہوں نے دورِ طالب علمی میں حصول علم کے لئے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں نے ان کی علمی بصیرت اور ذوق عمل سے بے حد فیض اُٹھایا ہے۔

ان کے علاوہ پروفیسر سنیتا زیدی، پروفیسر مجیب اشرف، پروفیسر رفاقت علی خاں، پروفیسر مشیر الحسن، پروفیسر نارائنی گپتا، پروفیسر محمد ذاکر، ڈاکٹر شہناز انجم صاحبہ، محترمہ ثریا نکہت صاحبہ، محترمہ دیاوتی صاحبہ، محترمہ نسرین سلطانہ صاحبہ، محترمہ افسر جہاں صاحبہ، ڈاکٹر شعیب، ڈاکٹر چمن آرا، ڈاکٹر عذرا عابدی اور عثمان علی صاحب کی بھی انتہائی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے

میری ہر قدم پر رہنمائی کی اور وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی صاحب (شعبۂ تاریخ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی) کا اعتراف نہ کروں۔ جنھوں نے میرے موضوع سے متعلق بہت سی کتابوں کی نشاندہی کی اور مختلف زاویۂ نگاہ سے تاریخی حقائق کو سمجھنے میں تعاون کیا۔

میں محترمہ یاسمین پروین صاحبہ (ڈائریکٹر بالک ماتا سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ان کے شوہر شمیم صاحب کی بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے رامپور میں میرے قیام کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کی اور پرسکون ماحول عطا کیا۔

رضا رامپور لائبریری میں ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب (آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی) کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے قلمی نسخوں سے استفادہ کرنے میں میری مدد کی اور میرے موضوع سے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی (اسسٹنٹ لائبریرین رامپور رضا لائبریری) حسن جمال عابدی صاحب (ڈپٹی لائبریرین، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ) اسماعیل صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ایم۔ این۔ فاروقی صاحب (انچارج لائبریری آئی سی ایچ آر) شاہد خاں صاحب (لائبریرین اردو گھر لائبریری، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ڈاکٹر صفی اللہ خاں صاحب، رشید صدیقی صاحب، عاصم صاحب، فیصل صاحب اور تنویر صدیقی صاحبہ کی بطور خاص شکر گذار ہوں، جنھوں نے مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کی فراہمی میں ہر ممکن مدد کی۔

میں اپنے والد محترم عبدالجبار صاحب اور والدہ محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں کچھ لکھ سکوں۔ ان کے نظریات، خیالات اور طرز فکر سے میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ میں آج جہاں تک بھی پہنچ سکی ہوں وہ انہی کی شفقت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اپنے بھائی بہنوں میں جمیل، جعفر، مختار، یاسمین، نازنین، نسرین کی بھی سپاس گذار ہوں جنھوں نے تحقیق کے سلسلے میں میرے لیے پرسکون ماحول پیدا کرنے میں ہر ممکن سعی کی۔ خاص طور پر جمیل صاحب کی کہ جو مواد اکٹھا کرنے کے سلسلے میں میرے لئے معاون ثابت ہوئے۔ ان کے علاوہ پرویز صاحب اور محسن صاحب کی بھی ممنون ہوں جو میرے حوصلے کو ہمیشہ

تقویت دیتے رہے۔

مواد کے سلسلے میں جن کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ،سیمنار لائبریری،شعبۂ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ،ڈاکٹر سید عابد حسین لائبریری اینڈ ڈاکیومنٹشن ،جامعہ ملیہ اسلامیہ،مرکزی اسلامی لائبریری (ابوالفضل انکلیو)،انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی،دیال سنگھ لائبریری،آزاد بھون لائبریری،آئی ۔سی۔ایچ۔آر۔لائبریری،ساہتیہ اکادمی لائبریری،سینٹرل سیکریٹریٹ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی، نیشنل میوزیم نئی دہلی،داراشکوہ لائبریری،سینٹرل لائبریری دہلی یونیورسٹی،سینٹرل لائبریری جے این یو،سینٹرل لائبریری جامعہ ہمدرد،نذیریہ کلیکشن جامعہ ہمدرد،دلی پبلک لائبریری،ہارڈنگ لائبریری،ایوانِ غالب ریسرچ لائبریری،غالب اکیڈمی لائبریری،رامپور،رضا رامپور لائبریری اورصولت پبلک لائبریری قابلِ ذکر ہیں۔

خصوصی طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ او رانجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے اراکین کتب خانہ کی شکر گذار ہوں۔ جنھوں نے کتب کی فراہمی میں ہر ممکن مدد کی۔

ڈاکٹر شہناز بیگم

جنوری ۲۰۰۴ء

تعارف

تعارف

ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں بابر نے ڈالی۔ اکبر کے عہد میں یہ حکومت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ مغل سلطنت کا عروج و استحکام سترھویں صدی کے وسط میں شاہ جہاں کے عہد تک برقرار رہا۔ حالانکہ اورنگزیب کے عہد میں یہ سلطنت اپنی وسعت کی انتہائی حدود تک پہونچی۔ مگر ساتھ ہی زوال کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ اس کی وفات (۱۷۰۷ء) اور خاص طور پر پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) سے مغل سلطنت کے استحکام پر پہلی ضرب پڑی۔

اٹھارھویں صدی کا ابتدائی عہد سیاسی طور پر ہندوستان کی تاریخ میں انتشار کا دور ہے۔ دلّی میں مغل سلطنت کی مرکزیت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ایک طرف سیاسی اور سرکاری ادارے ٹوٹ رہے تھے۔ تو دوسری طرف معاشرہ ان حالات سے بری طرح متاثر تھا۔ اس زوال آمدگی کے باعث جو انتشار اور ابتری پھیلی۔ اس نے لوگوں کی سماجی، ثقافتی اور معاشی زندگی کو بری طرح متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اس دور میں مغل سلطنت کمزور ہو چکی تھی اور علاقائی طاقتوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ایک ایک کر کے بنگال، اودھ، میسور اور حیدرآباد وغیرہ جیسی خودمختار ریاستیں وجود میں آئیں۔

ہندوستان میں سلطنت کے زوال کے آثار اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد نمودار ہونے شروع ہوئے۔ اس زوال کو اس کے جانشین آنے سے نہیں روک سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاسی طور پر کمزور ہو چکے تھے اور اپنے محلات کی چار دیواری میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہنے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔ درباری سازشوں نے حالات کو اور بھی نازک کر دیا۔ غیر ملکی حملہ آوروں کی وجہ سے جو ابتری پھیلی۔ اس کا سب سے زیادہ اثر دہلی پر پڑا کیونکہ یہی شہر صدیوں سے سارے ملک کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کا مرکز رہا ہے۔

اتفاق سے اسی عہد میں دلی اردو شاعری کا بھی مرکز تھی۔ زیادہ تر شعرا دہلی سے ہی وابستہ تھے۔ معاشرہ، تہذیب و تمدن، اخلاق و ادب غرض کہ اس عہد میں زوال کا اثر زندگی کے ہر ایک شعبے پر پڑ رہا تھا۔ اٹھارہویں صدی کی اس سیاسی کشمکش کی وجہ سے عالم فاضل، شاعر، ادیب وغیرہ ہر ایک اس بدامنی کا شکار تھا جس کو جدھر سہارا دکھائی دیا اس نے اس طرف کا رخ کیا۔ اس طرح دہلی کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے لکھنؤ، فیض آباد، عظیم آباد اور فرخ آباد وغیرہ ریاستوں کی طرف مراجعت شروع کر دی۔

مغل سلطنت کے زوال پر مؤرخین کے مختلف نظریات

مغل سلطنت کا زوال مؤرخین کے درمیان ہمیشہ بحث کا موضوع رہا ہے۔ زوال پر مؤرخین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

ولیم اروِن (۱) اور جادو ناتھ (۲) سرکار نے مغل سلطنت کے زوال کے لئے مغل بادشاہوں اور ان کے امراء کے کردار کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے یعنی انھوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کا آرام طلب ہو جانا ہی مغل سلطنت کے زوال کی اہم وجہ مانی ہے۔

جادوناتھ سرکار نے اپنی دوسری تصنیف ''ہسٹری آف اورنگ زیب'' (History of Aurangzeb) میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو بھی مغل سلطنت کے زوال کا اہم سبب مانا ہے۔ جس نے سیاست میں مذہب کو داخل کر کے ریاست کے اس سیکولر مزاج کو کمزور کر دیا۔ جس کی بنیاد کبھی اکبر نے ڈالی تھی۔

> ستیش چندر کا کہنا ہے کہ ''جہاں تک مغلیہ حکمراں طبقے کا سوال ہے۔ یہ کہنا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال امیر طبقے کی بدکرداری کی وجہ سے ہوا ٹھیک نہیں لگتا۔ مغلیہ حکمراں طبقے کا متحد نہ ہونا اور اس میں الگ الگ قوموں اور مختلف مذاہب

(1) William Irvine, The Later Moghuls, reprint, New Delhi, 1971.

(2) J.N. Sarkar, The Fall of the Mughal Empire, Calcutta, 1938

میں یقین رکھنے والے لوگوں کی شمولیت مغلیہ حکمراں طبقے کی
کمزوری کی وجہ سے کہا جا سکتا" (۱)

جیسا کہ جادو ناتھ سرکار نے مغل سلطنت کے زوال کے لیے اورنگ زیب کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے لیکن ستیش چندر نے جادو ناتھ سرکار کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ

"مغل سلطنت کے زوال کی بڑی ذمہ داری اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی پر رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اورنگ زیب کی موت کے چھ برس بعد جزیہ اٹھا لیا گیا اور ہندوؤں پر لگائی گئی پابندیاں (عربی، ایرانی، گھوڑوں پر سواری نہ کرنا اور مقدس مقامات پر ٹیکس) ہٹا لیے گئے۔ راجپوت راجاؤں کو خوش کرنے کے لئے انھیں پھر سے اونچے منصب اور عہدے دیے جانے لگے۔ بندیلہ راجپوتوں کو بھی رعایتیں دی گئیں۔ اس طرح اورنگ زیب کی تنگ نظری کی پالیسی کو بالائے طاق رکھ دینے پر بھی مغل حکومت کو نئی زندگی نہیں ملی۔ ستیش چندر نے زوال کی اہم وجہ دور وسطی کی سماجی و اقتصادی حالت کو بتایا ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں صنعت و تجارت کی رفتار بہت دھیمی رہی اور سائنس و تکنیک کے نقطۂ نظر سے ہندوستان دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ اس کی وجہ سے جاگیرداری کی روایت کی مشکلات بڑھیں۔ جس کی وجہ سے حکومت میں کمزوری، امیر طبقے میں بے اطمینانی اور گروہ بندی، نچلے طبقے میں رشوت خوری بڑھ گئی۔" (۲)

اس طرح جہاں ستیش چندر نے Parties and Politics at the Mughal Court, 1707-40

---

(۱) ستیش چندر، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، مترجم محمد قاسم صدیقی، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۷

(۲) ایضاً.................. ص ۲۴۸ تا ۲۵۰

میں جاگیرداری بحران کو مغل سلطنت کے زوال کے لیے ذمے دار ٹھہرایا وہیں انھوں نے اپنی دوسری تصنیف "Medieval India : Society, The Jagirdari Crisis and The Village" میں مغل منصب داروں اور علاقائی زمین داروں کے بیچ بڑھنے والی کشمکش کو بھی مغل سلطنت کے زوال کا اہم سبب قرار دیا ہے۔ علاقائی طاقتوں جیسے مرہٹہ، جاٹ وغیرہ طاقتوں کے عروج سے ان علاقوں کے زمین دار بھی مغل منصب داروں کے خلاف ہو گئے۔ چونکہ وہ نظام مالگزاری میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتے تھے، اب منصب داروں کو طرح طرح سے پریشان کرنے لگے۔ وہ یا تو وقت پر مالگزاری ادا نہیں کرتے تھے، یا پھر کسانوں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کر کے منصب داروں کو لگان ادا کرتے تھے۔ اس سے مغل منصب دار اپنے علاقے کی رعایا یعنی کسانوں کا تحفظ کرنے میں ناکام کر رہے۔ اور ان علاقوں میں اپنا اثر کھوتے جا رہے تھے۔ اس سے بھی ایک معاشی وسیاسی بحران پیدا ہو گیا اور جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا اہم سبب بنا" (۱)

عرفان حبیب (۲) مالگزاری سے متعلق مغلوں کی پالیسی کو ہی زوال کی اہم ترین وجہ بتاتے ہیں۔ اس لئے کہ مغل سلطنت اس وقت تک مستحکم رہی جب تک لگان سے ہونے والی آمدنی پابندی سے شاہی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ لیکن جب مالگزاری کے نظام میں نقائص ہونا شروع ہوئے تو اس کے نتیجے میں شاہی خزانے کی آمدنی گھٹ گئی، جب آمدنی کو بڑھانے کی خاطر سختی کی گئی اور اس میں زبردستی اضافہ کیا گیا تو بہت سے کسان تنگ آ کر کھیتی باڑی چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے جس سے زراعت پر برا اثر پڑا۔ اس طرح شاہی خزانے میں دن بدن کمی آتی گئی۔ آمدنی کے گھٹ جانے سے سلطنت اور اس کے اداروں کو مستحکم رکھنا دشوار ہو گیا۔

اطہر علی (۳) نے ستیش چندر کے نظریے کی پیروی کرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام میں آنے والے خرابیوں کو مغل سلطنت کے زوال کی اہم وجہ بتائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دکن میں ہونے والی فتوحات کی وجہ سے بڑی تعداد میں مرہٹہ اور دکنی امراء کو مغل منصب داروں کی حیثیت

(1) Satish Chandra, Review of the Crisis of the Jagirdari System, Article reproduced in "The Mughal State (1526-1750), ed. Muzaffar Alam & Sanjay Subrahmanyam, Delhi, 1998, P. 347-360.
(2) Irfan Habib, The Agrarain System of Mughal India, New Delhi, 1963.
(3) M. Athar Ali, The Mughal Nobility under Aurangzeb, Bombay, 1966.

سے تقرر کیا گیا۔ جس کی وجہ سے جاگیر میں دی جانے زمین یعنی "پائے باقی" کی کمی ہوگئی۔ اس طرح بادشاہ امراء کی بڑھتی تعداد کو خاطر خواہ جاگیر دے کر مطمئن نہ کر سکے۔

اطہر علی اپنے مختلف تحقیقی مقالات میں ایشیا کی مختلف سلطنتوں جیسے مغل، اُز بیک، صفوی اور عثمانیہ سلطنت کے زوال کو سائنس اور تکنیک کے میدان میں نہ ہونے والی ترقی کو بھی ذمے دار قرار دیا ہے۔ یہ سلطنتیں اپنی ہم عصر مغربی طاقتوں سے مقابلے میں ناکام ہوگئیں۔

نورالحسن (۱) کا کہنا ہے کہ مغل حکومت کے تحت زرعی روابط (agrarian relation) میں اوپر سے نیچے تک ہرم نما (Pyramid) شکل میں اختیاری ڈھانچے (authority structure) کا ارتقاء ہوا۔ اس بناوٹ کے تحت مختلف طرح کے اختیارات ایک دوسرے کے اوپر لاد دیئے گئے۔ نتیجے کے طور پر حکومت کے مالگزاری کے تقاضوں کا سب سے زیادہ اثر کسانوں پر پڑا۔ اٹھارہویں صدی میں مغل حکومت کے زوال کے ساتھ جاگیروں پر دباؤ بڑھنے لگا۔ اور زرعی نظام پر بحران چھا گیا۔

نورالحسن کے مطابق زمیندار ایک طبقے کی شکل میں حکومت کے تئیں کافی وفادار تھے۔ لیکن مغل حکومت کا زرعی نظام جس طرز کا تھا اس میں ان کے آپسی اختلافات کو چیک کرنا مشکل تھا۔ اکثر اس سے قانون اور نظم وضبط میں مشکلات پیدا ہوتی تھیں۔ جس سے سلطنت کی طاقت کو نقصان پہنچتا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کے کمزور ہونے سے یہ توازن بگڑ گیا۔ اس حالت میں زمینداروں کو ایک ایسا طبقہ ہی کنٹرول کر سکتا تھا جو خود زمینداروں کی حمایت سے بالاتر ہو۔ چونکہ اس وقت تک ایسا کوئی طبقہ ابھر کر سامنے نہیں آیا تھا۔ اس لیے زرعی روابط کی نوعیت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسی حالت میں اس نظام کا زوال ناگریز ہوگیا۔

M. N. Pearson, J.F. Richards اور Peter Hardy جیسے مغربی دانشوروں نے بھی دکن میں ہونے والی جنگوں کو مغل سلطنت کے زوال کی اہم وجہ مانا ہے۔ ان مؤرخین کا ماننا ہے کہ مغل نظام حکومت کافی حد تک بالواسطہ تھا۔ مرکز سے زیادہ دور دراز علاقوں میں علاقائی بندھن اور

(1) S. Nurul Hassan, "Zamindars under the Mughals," Land Control and Social Structure in Indian History. ed. R.E. Fryken berg, Madison, 1969.

رسم ورواج ہی زیادہ تر عوام کی زندگی کو کنٹرول کرتے تھے۔ مغل امراء بادشاہ کو اسی وقت تعاون دیتے تھے جب تک کہ فوجی مہمات میں کامیابی حاصل ہوتی رہتی تھی۔ ناکام ہونے کی صورت میں وہ امراء کا تعاون کھو دیتے تھے۔ اور اس طرح سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ میں دورِ وسطی میں کوئی مستحکم اور کامیاب حکومت قائم نہ رہ سکی۔

کرین لیونارڈ (۱) نے ''مالیاتی ادارے جو مہاجن، صراف، ساہوکار وغیرہ کے ماتحت تھے۔ ان کو گریٹ فرم (Great Firm) کا نام دیا ہے۔ ان کے مطابق ان اداروں نے حکومت کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے اپنا تعاون مغل سلطنت کو نہ دے کر ابھرتی ہوئی علاقائی طاقتوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو دینا شروع کیا تو مغل سلطنت زوال پذیر ہونی شروع ہوگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ مغل بادشاہ اور امراء کافی حد تک ان مالیاتی اداروں (گریٹ فرم) کے تعاون پر منحصر تھی۔ یہ ادارے مغل بادشاہ اور امراء کو قرض دیتے تھے، لگان اکٹھا کرنے میں ان کی مدد کرتے تھے کبھی کبھی یہ خزانچی کا بھی کام کرتے تھے۔ مغل بادشاہ ان کے تعاون کے بدلے ان کو انعامات سے نوازتے تھے مگر گجرات اور دیگر دوسرے علاقوں میں جب مغل سلطنت مرہٹوں اور دوسری ابھرتی طاقتوں سے ان کا تحفظ نہ کر سکی تو یہ مالیاتی ادارے مغلوں کا ساتھ چھوڑ کر ابھرتی ہوئی طاقتوں (مرہٹہ، جاٹ) کے ساتھ مل گئے۔ کچھ صراف دور دراز کے علاقوں میں بسنے لگے، چونکہ اب امراء اور شہزادے بھی تجارت میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اس لئے بھی ان مالیاتی اداروں کو مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ مغل دربار اور امراء سے دور ہوتے گئے۔ بعد میں ان ہی کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ساخت کو مضبوط کرنا شروع کیا اور مغل سلطنت کے زوال کا عمل تیز ہوا۔

Philip C Calkins (۲) اور M.N. Pearson (۳) نے کرین لیونارڈ کے نظریے (گریٹ فرم تھیوری) کی حمایت کی ہے۔ گجرات کے سلسلے میں Pearson نے اور Philip نے دوسری علاقائی

---

(1) Karen Leonard, "The Great Firm" Theory of the Decline of the Mughal Empire, camparative studies in Society and History, Vol. 21, No. 2, April, 1979, pp. 161-167. and also in "The Mughal State" ed, M. Alam & Sunjay Subrahmanyam, Delhi- 1998, P.398-418
(2) Philip C. Calkins, 'The Formation of a Regionally Oriented Ruling Group in Bengal', Journal of Asian Studies, Vol. XXIX, No. 4, August, 1970, pp-799-806.
(3) M.N. Pearson, Merchants and Rulers in Gujrat, California, 1976.

حکومتوں جیسے بنگال کے عروج کے بارے میں ان مالیاتی اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

فرینک پرلن (۱) نے بھی سی۔اے۔ بیلی (۲) اور کرین لیونارڈ کے نظریے کی پیروی کرتے ہوئے مغل حکومت کو "The Unchallenged Political form" ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مالیاتی اداروں (Corporate groups) یا سماجی طبقات (Social Classes) نے مغل دورِ حکومت میں "Commercialization" اور "Decentralization" کے عمل میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہوئے اٹھارہویں صدی میں زراعت کی وسعت اور تجارت کی ترقی میں تعاون دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی وفاداریوں کا رخ انگریزوں کی طرف تبدیل کرلیا۔ جو ان مالیاتی اداروں کے لیے سودمند تھا۔ پرلن (Perlin) کی نظر میں انگریزوں کی فتح ایک ہندانگریزی (Indo-British) معاملہ تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کا بھی کردار تھا۔

Andre Wink (۳) کے مطابق مغل حکومت کی بنیاد ''فتنہ'' (Fitna) (۴) پر تھی۔ جس کی مدد سے وہ مختلف طاقتور گروپ جیسے زمینداروں کے درمیان تال میل قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ایک خاص قسم کی پالیسی تھی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے مغل حکومت کو ایک حد تک وسیع کیا۔ مگر یہ پالیسی ایک مقام پر جا کر ناکام ہوگئی اور مغل حکومت کے زوال کا راستہ ہموار ہوگیا۔

کینٹ ویل اسمتھ (Cantwell Smith) (۵)، کنور محمد اشرف (۶)، عرفان حبیب (۷) اور اطہر علی (۸) نے مغل حکومت کے زوال کا سبب معاشرتی بحران (Societal Crisis) بتایا ہے۔ ان کے مطابق ''ہم عصر معاشرہ ایک بڑی سلطنت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ضروری زاید پیداوار جٹانے میں ناکام ہوگیا جو دوسرے لفظوں میں زوال کا اہم سبب بنا۔

---

(1) Frank Perlin, 'State Formation Reconsidered, MAS, XIX (3), pp. 415-480
(2) C A Bayly, Rulers, Townsmen and Bazars: North Indian Societ y in the Age of British Expansion, 1770-1870, Cambridge, 1983
(3) Andre-Wink, Land and Sovereignty in India- Agrarian Society and Politics under the Eighteenth Century Maratha Svarajya, Cambridge, 1986, p.34

(۴) یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی بغاوت (Sedition) ہیں

(5) Cantwell Smith, 'Lower Class Uprisings in Mughal Empire', Islamic Culture, 1946, pp.21-40.
(6) K M Ashraf, 'Presidential Address to the Medieval Indian Section', PIHC, 23rd Session, Aligarh, 1960, pp 143-152
(7) Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India, Bombay, 1963, pp. 317-351.
(8) M Athar Ali, 'The Passing of Empire: The Mughal Case', Modern Asian Studies, Vol. 9, No 3, 1975, pp 385-396

(Declined as society failed to produce enough Surplus to sustain a vast all- India Polity)

مظفر عالم(۱) نے مغل حکومت کے زوال کی وضاحت کرتے ہوئے "Region-Centric" نظریہ اپنا۔ عالم کا کہنا ہے کہ مغل حکومت مختلف علاقوں کے متصادم گروہوں (Conflicting Communities) اور وہاں کے دیسی سماجی و سیاسی نظام (indigenous Socio- Political System) کے درمیان تال میل قائم کرنے والی ایجنسی کا کردار ادا کرتی تھی۔ ایک معنی میں حکومت کی بنیاد منفی تھی۔ حکومت کی تمام طاقت مقامی گروہوں پر منحصر تھی۔ جو اپنے محدود علاقوں سے باہر نکل کر خود کو منظم کرنے میں نا اہل تھے۔ مغل ہندوستان میں ہوئے سیاسی اتحاد (Political integration) میں کئی طرح کی خامیاں تھیں۔ سماجی گروہوں کی قیادت کرنے والے مقامی قائد (Local magnates) اپنے مفاد اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے کافی حد تک کچھ شرائط کے ساتھ مرکز سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ مقامی قائد جانتے تھے کہ وہ اپنے زور پر کچھ نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے امراء اپنی طاقت اور عہدے کے لئے مغل بادشاہ کے تابع دار ہوتے تھے۔ بادشاہ ہی ان کی تقرری کرتا تھا۔ حکومت ان کی آمدنی کے ذرائعوں پر بھی نظر رکھتی تھی۔ وہ ایک طرح سے مغل بادشاہ کے نمائندے ہوتے تھے۔ جاگیر منتقل (Jagir Transfer) کی پالیسی کا اہم مقصد ان پر کنٹرول کرنا تھا جس سے سلطنت کا ڈھانچہ مضبوط رہے۔ لیکن امراء کو اس پالیسی سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اس وجہ سے ۱۷ویں صدی کے دوران مغل حکومت کے کئی علاقوں میں اس پالیسی کو پُر اثر طریقے سے عمل میں نہیں لایا جا سکا۔ زمیندار، امراء، قصبوں و دیہات کا مددِ معاش یافتہ طبقہ اور مختلف مقامی عہدے داران سلطنت کے ڈھانچے میں ایک دوسرے کے ساتھ مدغم تھے۔ مددِ معاش زمینیں مختلف زمینداروں کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا مقصد حکومت کے دور دراز کے دیہی علاقوں تک حکومت کا دبدبہ قائم کرنا تھا۔ مغل بادشاہوں کا یہ ماننا تھا کہ مددِ معاش یافتہ طبقہ باغی زمینداروں کی طاقت پر کنٹرول

(1) M. Alam, The Crisis of Empire in Mughal North India, Awadh and the Punjab, 1707-1748, New Delhi, 1986.

رکھنے میں تعاون کرسکیں گے اور اس طرح حکومت کے سماجی وسیاسی نظام میں توازن بنا رہے گا۔

مظفر عالم کا مزید کہنا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغل حکومت زمینداروں، جاگیرداوں، مددِ معاش یافتہ طبقوں اور اودھ کے شیخ زادوں جیسے مقامی طاقتور گروپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکی۔ نتیجے کے طور پر مغل حکومت کا زوال ہوگیا۔ ۱۸ویں صدی کے ابتداء میں امراء اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے زمینداروں کے ساتھ آزادانہ سیاسی صف بندی (Political alignment) کرنے لگے۔ اس کے علاوہ مغل حکومت کے مختلف حصہ دار (زمیندار، مددِ معاش یافتہ طبقہ) ایک دوسرے کے اختیارات اور علاقوں کو ہڑپنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ اس طرح کے حادثات بالکل نئے نہیں تھے۔ لیکن مغل حکومت کے عروج کے زمانے میں یہ کنٹرول میں رہے۔ انھیں کنٹرول میں رکھنے کے لئے کبھی فوجی طاقت کی مدد لی جاتی تھی اور کبھی ایک طبقہ یا گروہ کے قریب دوسرے طبقے کو بسا دیا جاتا تھا۔

مظفر عالم خصوصی طور سے یہ تجزیہ کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۸ویں صدی کے آغاز میں سماجی اور سیاسی توازن کس طرح بگڑ گیا؟ دوسرے الفاظ میں کن وجوہات سے ۱۸ویں صدی میں مغل حکومت کا زوال ہوگیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۷ویں صدی کے اختتام پر اور ۱۸ویں صدی کے آغاز میں اودھ اور پنجاب میں اقتصادی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عالم کا مطالعہ ستیش چندرہ اور دیگر مؤرخین کے اٹھارہویں صدی کے آخر میں مالی بحران کے خیال سے بالکل مختلف ہے۔ سماج کے وہ طبقے جو مغل حکومت کو استحکام بخشنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ انھوں نے علاقوں میں ہوئی اقتصادی گرم بازاری سے فائدہ اٹھایا۔ ان میں سے کئی لوگوں نے اس کی مدد سے اپنی طاقت بڑھائی اور دوسروں کے حقوق کو ہڑپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس صورتحال میں مغل حکومت کے سیاسی ڈھانچے پر برا اثر پڑنا ناگریز تھا۔ نتائج بیان کرتے ہوئے مظفر عالم کہتے ہیں کہ اودھ اور پنجاب میں مغل زوال کی جھلک اس طرح کی سیاسی کایا پلٹ (Political transformation) اور ایک نئی صوبے داری کے اجزاء کے ابھرنے میں نظر آنے لگی۔ ان دونوں صوبوں میں آزاد علاقائی اکائیوں کی شکل میں ابھرنے کے بھی اجزاء موجود تھے۔ پنجاب میں اس سے بدانتظامی پھیلی۔ لیکن اودھ میں ایک پائیدار حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔

چیتن سنگھ(۱) نے بھی مظفر عالم کی طرح زوال کی وضاحت کرتے ہوئے "Region Centric" نظریہ اپنایا۔ مغل عہد کے پنجاب صوبے کا خاص طور پر مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بے شک مغل انتظامی ڈھانچہ (Administration infrastructure) مختلف علاقوں کو مرکزی حکومت سے جوڑتا تھا۔ لیکن اتحاد قائم رکھنے کے اس روایتی طریقے میں اپنی کچھ مشکلات تھیں۔ مقامی سماج اور سیاست میں کئی طرح کی کشیدگیاں ہوتی تھیں اور اس سے نپٹنے کے لیے کبھی کبھی انتظامیہ علاقائی سطح پر طرز نظام کی حدود کو پار کر بھی متوجہ ہوتی تھی۔ نتیجتاً انتظامیہ مقامی عہدہ داران کے تقرر اور ان کے فرائض تحصیل کے طریقہ کے معاملہ میں لچیلا پن اختیار کرتی تھی۔ مالگزاری نظام میں وقت گزرنے کے ساتھ قائم شدہ اصول اور طریقوں کے متوازی نئے طریقہ جڑ پکڑنے لگے جس نے حکومت کو استحکام بخشا۔

چیتن سنگھ کے مطابق ۱۷ویں صدی کے آخر میں سندھ ندی میں گاد جما ہونے سے پنجاب میں دریائی راستوں سے آمدورفت (riverine traffic) بری طرح متاثر ہوئی۔ اس سے پنجاب کے اقتصادی نظام پر برا اثر پڑا۔ ہم عصر تی میں سیاسی کشمکش (Political upheavals)، ایران کے شاہ کا قندھار پر قبضہ اور مغلوں کے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی وجہ سے بری راستے (overland traffic) میں بھی رکاوٹ کھڑی ہوگئی۔ اسی وقت شمال مغربی پنجاب میں یوسف زئی بغاوت (۱۶۶۷ء) اور آفریدی بغاوت (۱۶۷۸ء) بھی ہوئی۔ چیتن سنگھ کا ماننا ہے کہ اس سیاسی بحران کا اثر پنجاب کے سماج اور اقتصادی نظام پر پڑا۔ اس سے تجارت متاثر ہوئی اور آہستہ آہستہ زراعت پر منحصر پنجاب کا اقتصادی نظام نیست و نابود ہوگیا۔

پنجاب میں سماجی و اقتصادی ڈھانچے کے کمزور پڑتے ہی سماجی بحران پیدا ہونے لگا۔ حالانکہ چیتن سنگھ کا ماننا ہے کہ پنجاب میں ہر جگہ اقتصادی ترقی یکساں نہیں تھی۔
اس لئے اقتصادی نظریے سے ترقی پذیر علاقوں میں ہی زیادہ تحریکین ہوئیں کیونکہ تجارت کے زوال کا اثر ان ہی علاقوں پر سیدھا پڑا۔ اور ان ہی علاقوں میں سکھ بغاوتیں زیادہ ہوئیں۔

(1) Chetan Singh, Region and Empire, Punjab in the Seventeenth Century, New Delhi, 1991.

اس طرح وہ ان نتائج پر پہونچے کہ پنجاب میں سماجی بحران اور بالآخر مغل حکومت سے ان علاقوں کا قطع تعلق ایک لمبے عمل کا نتیجہ تھا۔

اٹھارہویں صدی کے پہلے سے جب مغل حکومت سیاسی طور سے کمزور ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ عمل آہستہ آہستہ ایک طے شدہ رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہیں پر مغل حکومت کے بحران کے سوال کو سنگھ کے مطالعے نے ایک نیا موڑ دیا۔ مظفر عالم صوبہ اودھ اور پنجاب کے مغل حکومت سے الگ ہونے کے عمل کی ابتداء اٹھارہویں صدی کی شروعات سے مانتے ہیں جبکہ سنگھ کا ماننا ہے کہ یہ عمل مغل سلطنت کے عروج کے عہد میں بھی چل رہا تھا۔ اس طرح پنجاب کی علاقائی تاریخ کے نظریے سے مغل حکومت کے زوال کے عمل کا تجزیہ کرنے پر الگ تصویر ابھر کر آتی ہے۔ مختلف صوبوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر سلطنت سے اپنے کو الگ نہیں کیا بلکہ اکثر قطع تعلق کا یہ عمل سماجی و سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے پیدا ہوا۔ جس پر مغل حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔

علی گڑھ کے مشہور مؤرخین عرفان حبیب، نورالحسن، اقتدار عالم خاں، اطہر علی وغیرہ کو جدید مؤرخین کے ایک گروپ نے (مظفر عالم، چیتن سنگھ، سنجے سبرامنیم، سی اے بیلی شامل ہیں)۔ ایک خصوصی نظریے کی بنا پر ''علی گڑھ اسکول'' (۱) کا نام دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ علی گڑھ اسکول نے مغل ''سلطنت کے مرکزیت'' (Mughal centric View) کے پہلو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہ خود اس نظریے کے علم بردار ہیں کہ دور دراز کے علاقوں میں علاقائی راجہ اور زمیندار بہت طاقتور تھے۔ اور مغل حکومت کی اطاعت پوری طرح قبول نہیں کرتے تھے۔ ان زمینداروں اور علاقائی سرداروں نے جب اپنا تعاون مغل حکومت کو دینا بند کر دیا تو حکومت کے زوال کا عمل تیز ہوا۔ اور علاقائی طاقتوں کا عروج ہوا۔

---

(۱) علی گڑھ مؤرخین کے بارے میں فرینک پرلن (Frank Perlin) نے ایک دوسری اصطلاح "Mughr، Centred historian" بھی استعمال کی ہے جس کی وجہ ان مؤرخین کا مغل حکومت کی مرکزیت سے متعلق ایک خاص نظریہ رکھنا ہے یہ اصطلاح دوسرے ان مؤرخین کے لئے بھی ہے جو علی گڑھ کے دانشوروں کے ہم خیال ہیں۔

(1) State Formation Reconsidered, MAS, XIX. (3) p.415-480.

Burton Stein (۱) نے مغل حکومت کے ''انتہائی مرکزیت'' (Mughal centric View)
پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے اس کو "Segmentary State" کے نمونے سے موازنہ کیا اور اس بات
پر زور دیا کہ مغل حکومت دور دراز کے علاقوں میں اتنی با اثر نہیں تھی کیونکہ یہاں علاقائی طاقتوں کا
دبدبہ تھا۔ جو علاقہ مرکز سے جتنا دور تھا مرکز کا کنٹرول اسی طرح سے کم ہوتا جاتا تھا حالانکہ یہ بات
انھوں نے جنوبی ہندوستان کی حکومت کے بارے میں خاص طور سے کہی ہے۔ لیکن ان کا اشارہ
۱۷ویں صدی کے ہندوستان اور مغل حکومت کے زوال کی جانب ہے۔

علی گڑھ مؤرخین نے اپنے مخالف خیالات رکھنے والے اس گروپ کو
"Revisionists" کا نام دیا ہے۔ اطہر علی (۲) نے اپنے ایک مقالے میں اس بات پر زور دیا کہ
''مرکزیت اور مطلق العنانیت دو الگ الگ موضوع ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک بڑی حکومت
''مرکزیت'' کی انتہائی حدود کو چھو لے۔ دوسری طرف چھوٹی ریاست بھی غیر مرکزیت کا شکار ہو سکتی
ہے۔ انہوں نے ایک بار پھر مغل حکومت کے انتہائی مرکزیت کے پہلو کی پُر زور حمایت کی ہے مگر
ساتھ ہی اس بات سے انکار نہیں کیا ہے کہ مغل حکمراں اپنا کوئی قانونی ضابطہ (Legal System) جو
مذہب اور روایتی قوانین سے ہٹ کر ہو اور ساتھ ہی مستقبل کے لئے ایسا نظام جو معاشی ترقی کے
لئے مددگار ثابت ہو تشکیل کرنے میں ناکام رہے۔ جو زوال کا ایک اور اہم سبب ہے۔

اس طرح جدید مؤرخین کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ مغلیہ
سلطنت کے زوال کا کوئی ایک خاص سبب نہیں تھا بلکہ کئی اسباب تھے۔ یہ اسباب مختلف تھے اور
اپنے آپ میں پیچیدہ تھے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی کے شعراء نے مغل سلطنت کے زوال کو
اپنے مشاہدے کی بنا پر اشعار میں نمایاں کیا ہے۔

اُردو شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے ہر ایک پہلو عکاسی کی جا سکتی
ہے۔ اٹھارہویں صدی کا تاریخی مطالعہ کرتے وقت شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس
عہد کی شاعری میں ہندوستانی معاشرت کی ترجمانی ملتی ہے۔ اس کے آئینے میں ساری قوم کا چہرہ

(1) Burton Stein, Peasant State and Society in Medieval South India, Delhi, 1980, p.23.
(2) M. Athar Ali, The Mughal Polity- A Critique of "Revisionist" Approaches, IHC, 1992, p.303-312.

نظر آتا ہے۔ اردو شاعری کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی انحطاط نے اس عہد کے لوگوں میں کیا رجحانات پیدا کر دیے تھے۔ کس طرح مغل حکمراں زوال کا شکار ہوئے اور کس طرح ہندوستانی معاشرے کے مختلف شعبوں میں زوال کے اثرات مرتب ہوئے اس کی مکمل تفصیل اردو غزلوں، شہر آشوبوں، ہجویات اور مثنویوں میں ملتی ہے۔

یوں تو اس کتاب میں اُردو شاعری کی ان تمام اصنافِ سخن کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کے ذریعے مغل حکومت کے زوال کی عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن شہر آشوب پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے۔ کیونکہ اس صنف میں آخری مغل حکمرانوں کے سیاسی زوال، امراء و روساء کی تباہی و بربادی، سماج کے ہر طبقے کی اقتصادی بدحالی، فوجی نظام کا عبرت ناک زوال، اہلِ ہنر کی بربادی وغیرہ کی عکاسی بہت واضح طور پر کی گئی ہے۔

اُردو شعراء بحیثیت وقائع نویس:

اس عہد کے شعراء نے سماج کا جو نقشہ پیش کیا ہے یا اس سے متعلق جو تلمیحات اور تشبیہات و استعارات استعمال کیے ہیں وہ پُر معنی ہیں۔ شعراء کا تعلق نہ صرف اعلیٰ طبقے سے تھا بلکہ سماج کے ہر ایک طبقے سے تھا۔ وہ بھی سماج کا ایک حصہ تھے۔ انھوں نے معاشرتی، اقتصادی حالات میں ہو رہی تبدیلیوں کو قریب سے دیکھا۔ بہ حیثیت سماج کے ایک رکن کے ان کو بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا سامنا اس عہد کی عوام کر رہی تھی۔ شعراء نے مختلف طبقات کے سماجی و اقتصادی حالات کو شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس طرح شعراء وقائع نویس کی طرح حالات کا تذکرہ شاعری میں کرتے رہے۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان میں جو تباہی و بربادی پھیلی اس کا سب سے زیادہ اثر دہلی پر پڑا۔ زیادہ تر شعراء جیسے جعفر زٹلی، محمد رفیع سودا، میر تقی میر وغیرہ ہم عصر شعراء دہلی سے وابستہ تھے۔ اس لیے زوال کی ہر جنبش ان کو متحرک و متزلزل کر رہی تھی۔ انھوں نے مغلوں کی تباہی اور زوال پر سیاسی فضا کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ شاعر چونکہ حساس ہوتا ہے ہر پہلو پر اس کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اور وہ اپنی شاعری کو اظہار جذبات کا آلہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

ان شعراء نے اورنگ زیب کے بعد تخت نشین ہونے والے مغل بادشاہوں، ان کے وزیروں، امیروں، مختلف صوبے داروں اور سرکاری ملازموں کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان سب کی کوتاہی، نا اہلی اور لاپرواہی کو شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں ان لوگوں کے کردار اور نظم و نسق پر کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اور ان کی حرکتوں پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ظلم وستم، رشوت خوری، فرائض کی انجام دہی سے غفلت اور دیگر غیر قانونی حرکتوں کی انتہائی بے باکی سے مذمّت کی گئی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے اخلاقی زوال، غیر مہذب حرکتوں اور شرمناک افعال پر بھی سخت گرفت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شعراء نے عوام وخواص دونوں کی اقتصادی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شعراء نے شاعری کے لیے مواد اس وقت کے حالات سے حاصل کیا ہے۔ دلّی میں اُردو شاعری کی ابتداء ولؔی کے دلّی میں آنے کے بعد ہوئی۔ دراصل یہ ایک ادبی انقلاب تھا۔

غزل:

غزل جو اُردو شاعری کی اہم ترین صنف ہے۔ اس کے حوالے سے یہ دیکھنا ہے کہ اس صنف نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کس حد تک کی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ غزل کا موضوع حسن وعشق کی باتوں تک ہی محدود ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ غزل نے ہر دور اور زمانے میں سیاسی وسماجی اور عوامی مسائل کی بہترین عکاسی کی ہے۔ فکری اعتبار سے غزل میں فلسفہ، تہذیب وتمدن اور معاشرتی تاریخ کا عکس مختلف طرح سے ملتا ہے۔

میر تقی میرؔ اور ان کے ہم عصر شعراء نے اپنے عہد کی خستہ حالت اور ملک کی بربادی و بداخلاقی کی تصویریں غزل کے ذریعے پیش کی ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر اس وقت کے معاشرے کے ذہنی رجحان کا اندازہ ہوجاتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس وقت کے معاشرے کا کیا حال تھا۔ تہذیب وتمدن کس سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ میر تقی میرؔ، محمد رفیع سوداؔ اور مصحفیؔ وغیرہ شاعر جو اس زمانے کے حالات میں کسی نہ کسی طرح شریک عمل تھے، ان سب کے یہاں ایسے اشعار موجود ہیں۔ جن میں سیاسی رائے زنی یا سکھوں کی برائی، یا پھر انگریزوں کی نکتہ چینی ہے۔

غزل میں اس عہد کے رسم و رواج، لباس، وضع قطع اور لوگوں کی خستہ حالی پر جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شعراء اپنے ماحول اور سماج کے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے۔ غزل معاشرے کو زندگی کے تصورات عطا کرتی رہی ہے۔ اس طرح اس میں نہ صرف حکمراں طبقے کی زندگی کے بارے میں واضحات ہوتی ہیں۔ بلکہ معاشرے کے ان طبقات کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہے جو کہ پیشے کے لحاظ سے سماج میں کسی خاص وقعت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ جس کا ذکر تاریخی مآخذ میں نہیں ملتا۔ مغل بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیرا جانا، قید کیا جانا اور بے دردی سے تہ تیغ کر دیا جانا جیسے عبرت ناک مناظر کو میؔر، سوؔدا وغیرہ ہم عصر شعراء نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ احمد شاہ بادشاہ کو جس طرح اندھا کیا گیا اس کا ذکر میؔر نے بڑے ہی پُر اثر انداز میں کیا ہے۔

بہر حال اُردو شاعری کی قنوطیت پسندی، غم پرستی، دنیا سے بے زاری غزل کی نمایاں خصوصیات ہو گئیں۔ جن کے سانچے میں اس وقت کی ذہنیت ڈھل رہی تھی۔ اردو میں غزل براہ راست فارسی ادب سے وجود میں آئی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ فارسی غزل گوئی کے عروج کے وقت اسلامی حکومتوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اسی طرح اردو غزل گوئی کے ارتقاء کے وقت مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس انتشار شدہ ماحول میں غزل نے ارتقائی منازل طے کیں۔ جس کے باعث غزل میں اس دور کے حالات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

شہر آشوب:

اُردو میں شہر آشوب نگاری کا باقاعدہ آغاز اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہوا۔ سیاسی ابتری، معاشی بحران اور سماجی افراتفری کے اس دور سے اردو شاعری شمالی ہندوستان میں اپنے دورِ آغاز میں شدت سے متاثر ہوئی۔ اس طرح شہر آشوبیہ نظمیں اسی بحرانی کیفیت، اخلاقی زوال اور اقتصادی بدحالی کے بیان کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں۔

ان شہر آشوبوں میں آخری مغل بادشاہ کی نا اہلی، امرائے سلطنت کی ناکردگی، عیاشی، فرائض کی انجام دہی سے کوتاہی، غفلت شعاری، سیاسی ابتری دربار اور عدالت میں رشوت کی گرم

بازاری، شاہی گھرانے کی خستہ حالی، فوجی لشکروں کی تباہی، فوجیوں کی پریشانیاں، دلّی شہر کی بربادی، معاشرہ کی بدحالی، دست کاروں اور پیشہ وروں کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر ملتا ہے۔ زیادہ تر شہر آشوب دلّی، روہیلکھنڈ، اودھ، بہار، اکبر آباد سے متعلق ہیں۔ اس قسم کی سب سے پہلی اردو نظم غالباً میر جعفر زٹلی نے لکھی۔ اس کے بعد محمد شاکر ناجیؔ، درگاہ قلی خاں، محمد رفیع سوداؔ، شیخ ظہور الدین حاتمؔ، قیام الدین قائمؔ چاندپوری، جعفر علی حسرتؔ، میر تقی میرؔ، شیخ غلام علی راسخؔ، محمد جعفر خاں راغبؔ وغیرہ نے شہر آشوب لکھے۔ اس قسم کی نظمیں لکھنا ایک شعری روایت بن گئی اور ایک بڑی تعداد میں شہر آشوب کہے گئے۔ یہ سلسلہ (۱۸۵۷) کے چند برس تک جاری رہا۔

میر جعفر زٹلی نے دو شہر آشوب لکھے۔ پہلی نظم کا عنوان، ''نوکری نامہ'' ہے۔ زٹلی نے اس کے پہلے شعر میں نوکری کی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس حقیقت کی نشان دہی کے علاوہ انہوں نے برسرِ روزگار فوجیوں کو تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے درپیش اذیتوں کا مفصل ذکر کیا ہے۔

زٹلی کے دوسرے شہر آشوب سے معاشرتی اختلال کا علم ہوتا ہے۔ انہوں نے معاشرت کی معین قدریں زیر و زبر ہونے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ محمد شاکر ناجیؔ کا شہر آشوب بھی اسی عہد کی حالات کا صحیح مرقع ہے۔

سوداؔ کے شہر آشوب جو نادر شاہ کے حملے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ملک کی ابتری اور بد حالی کے آئینہ دار ہیں۔ خصوصاً قصیدہ ''در ہجو اسپ موسوم بہ تضحیک روزگار'' جس میں سوداؔ نے محمد شاہی دور کی زبوں حالی کا ایک نئے انداز میں نقشہ پیش کیا ہے۔

حاتمؔ کے شہر آشوب سے نادر شاہ کے حملے کے مابعد اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اس شہر آشوب کے شروع میں معین اقدار کی درہمی اور نظم و نسق پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ حاتمؔ کے اس شہر آشوب کی خصوصیت ہے کہ اس میں نچلے طبقے کی دولت مندی عشرت پسندی اور آرام و آسائش کا مفصل بیان ملتا ہے۔ اس میں جس طبقاتی تنگ نظری کا اظہار کیا ہے۔ وہ جاگیر داری نظام کی ایک نمایاں سماجی خصوصیت ہے۔ اس لئے اس نظم سے اس عہد کے لوگوں کے اندازِ تفکر کو سمجھنے اور ان کی معاشرتی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

حاتم کے دوسرے شہر آشوب میں اعلیٰ طبقے کی اقتصادی بدحالی کا بیان ملتا ہے اس کے علاوہ چاروں طرف پھیلی ہوئی بے کاری، نوکری میں تنخواہ کی ادائیگی، مفلسوں کے دولت مند ہو جانے اور عام فاقہ زدگی کا مضمون بھی نظم کیا گیا ہے۔

قائم کا مخمس شہر آشوب سکرتال کی لڑائی سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں مغل حکومت کی خرابی اور کئی بادشاہوں کی نااہلی کا ذکر ملتا ہے۔

جعفر علی حسرت کے شہر آشوب کا عنوان "مخمس در احوال شاہجہاں آباد" ہے۔ انہوں نے یہ نظم احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلی کی تباہی پر لکھی۔ یہ شہر آشوب دلی کی عمارتوں، باغوں کی خوبی اور ابدالی کے حملے میں ان کی بربادی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ بادشاہِ وقت عالمگیر ثانی کے بارے میں اس نظم سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ ابدالی کی لوٹ مار کے سبب اس کے پاس فوجی جانور مال و دولت اور جواہر میں سے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ حسرت نے کچھ طبقوں کی تنگدستی کا خاکہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سپہ گری، نجوم، طبابت، شاعری، مصوری خطاطی، سوداگری وغیرہ کے ماہرین کو پیٹ بھر روٹی تک میسر نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح اس شہر آشوب سے سیاسی و اقتصادی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر کے شہر آشوب کا عنوان "مخمس در حال لشکر" ہے اس شہر آشوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں لشکر کی تنظیم اور سامان رسد کی فراہمی کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس لئے لشکر میں قحط پڑ جانا اور پیشہ ور سے لے کر بادشاہ تک ہر ایک مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اس سے ان تاریخی واقعات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بادشاہ اور امیروں کے پاس فوج رکھنے کے وسائل بہت محدود تھے میر کا کہنا ہے کہ اقتصادی بدحالی کے باوجود امیروں کا سب سے بڑا مشغلہ لذت کوشی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ اس شہر آشوب سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر رشوت خور، لالچی اور خود غرض تھے۔

راسخ کے شہر آشوب کا عنوان مثنوی "در بیانِ انقلابِ زمانہ وشکایت فلک مجمل احوال مقیمان بلدۂ عظیم آباد" ہے۔ اس میں انہوں نے مشائخ، خطاط، معلم، شعرائے کامل، دکاندار، مزارع، تاجر طبیب، مصاحب اور سپاہی کی اقتصادی پسماندگی پر روشنی ڈالی ہے ان کا احوال ایسا نمونہ ہے جو اس عہد کے اقتصادی ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

مصحفی کے قصیدے شہر آشوب میں مہادجی سندھیا کے عہد وزارت کے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں شاہ عالم ثانی کی بے دست و پائی، سندھیا کے نظم ونسق کی خرابی اور دلی

میں لوٹ مار کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے آخری اشعار میں سلاطین کی فاقہ کشی کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصحفی کی شہر آشوبیہ غزل سے فوجیوں کی انتہائی قلیل تنخواہ مقرر کئے جانے اور اس کی ادائیگی بھی ممکن نہ ہونے کا علم ہوتا ہے۔

راغب کی مثنوی شہر آشوب میں عام ابتری اور صوبہ بہار کے مختلف شہروں کے اجڑنے کا ذکر ملتا ہے۔انہوں نے اس میں سپاہی اہل دفتر، مہاجن اہل بازار، صرّاف عطار، کبابی مفرح فروش و تنبولی نانبائی وقصاب، رنگریز، معلم، مطرب، تاجر، مزارع، کاتب، مصاحب، شعراء، اہل حسن اور ''باغبان'' کے عنوانات کے تحت ان پیشوں کی حالت بیان کی ہے۔

اس طرح شہر آشوب کا مطالعہ اس دور کے ہندوستان کی حالت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ان شعراء نے اپنے مشاہدات تجربات خیالات اتنی عمدگی سے پیش کئے ہیں جس سے ہر ایک پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔

مثنوی

مثنوی سے تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس طرح مثنوی اپنے عصر کی ذہنی اور سماجی زندگی کے تاثرات کا مخزن ہوتی ہے۔اٹھارہویں صدی کے شعراء نے مثنوی کے ذریعے اس عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی رجحانات کی عکاسی کی ہے۔میر کی مثنوی ''تسنگ نامہ'' اور ''در بیان کذب'' اس عہد کے بارے میں جاننے کا اہم ترین ماخذ ہے۔''تسنگ نامہ'' سے بادشاہ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بےنوائی کے لیے ان کا نام ضرب المثل ہو گیا تھا۔

میر نے جس وقت یہ مثنوی لکھی اس وقت شاہ عالم ثانی تخت نشین تھے۔اسی طرح مثنوی ''در بیان کذب'' میں انہوں نے بتایا ہے کہ شاہی منشی کس طرح رشوت لیے بغیر عرصے تک تنخواہ نہ دیتے تھے۔اس طرح اس مثنوی سے دلی کے شاہی دفاتر کی بدنظمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سودا کی مثنوی ''ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال'' سے اس زمانے کی بدامنی کا حال معلوم ہوتا ہے سودا نے اس میں کوتوال کی ہجو کے پردے میں شہر کی بدنظمی، حکام کی رشوت خوری اور اس عہد کے نظم ونسق پر روشنی ڈالی ہے۔میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان سے اس عہد کی معاشرتی زندگی کے بارے میں علم ہوتا ہے۔اس طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مثنوی اس دور کے بارے میں جاننے کا اہم ترین ماخذ ہے۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کا تاریخی مطالعہ کرتے وقت اُردو شاعری کی ان اصنافِ سخن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس عہد کے سیاسی واقتصادی اور سماجی حالات کے بارے میں جاننے کا ایک بیش قیمتی ماخذ ہیں۔

مآخذ کی درجہ بندی:

اس کتاب کو لکھنے میں جن مؤرخین کی تصانیف یا ماخذ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان ماخذ کو تین درجات میں اس طرح بانٹا گیا ہے:

I۔ ہم عصر مؤرخین

II۔ ہم عصر شعراء

III۔ ہم عصر مؤرخین

I۔ ہم عصر مؤرخین

اس ضمن میں خافی خاں۔ غلام حسین طباطبائی، درگاہ قلی خاں، شاہ ولی اللہ، اظفری، صمصام الدین شاہنواز، مرزا محمد حسین قتیل وغیرہ ہم عصر مؤرخین کی تصانیف کے مطالعہ سے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

خافی خاں: (ہاشم علی خاں خافی خاں نظام الملک):

خافی خاں کی تصنیف ''منتخب الباب'' (فارسی ماخذ) جس کا اُردو ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ اس مقالے میں حصہ چہارم کو بطور ماخذ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ جلد مغلیہ سلطنت کے زوال کا نہایت عبرت ناک مرقع ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے بعد پیش آنے والے واقعات کو مرتب کیا گیا ہے۔ شاہ عالم کے عہد سے لے کر محمد شاہ (رنگیلا) کے عہد تک کے واقعات اس میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ نادر شاہ کے حملے کی وجہ سے دلّی میں جو بربادی پھیلی اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ خافی خاں بذاتِ خود ان واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس طرح خافی خاں نے شاہانِ مغلیہ کے قریب رہ کر مغل دربار کے ظاہر و باطن کو بچشم خود دیکھا ہے۔ اس کتاب میں خافی خاں نے بہ حیثیت چشم دید تمام حالات کو تحریر کیا ہے ''منتخب الباب'' کا اس عہد کے تاریخی ماخذ میں اہم مقام ہے۔

محمد ظہیر الدین اظفری:

اظفری نے شاہ عالم کے عہد کے اہم واقعات پر ''واقعات اظفری'' لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ عبدالستار نے کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کیونکہ اظفری شاہ عالم کے ہم جد اور ان کے ہم عصر تھے۔ یہ اورنگ زیب کی پوتی نواب عفت آرا بیگم کے نواسے تھے۔ اس کتاب میں اظفری نے غلام قادر روہیلہ کے شاہ عالم ثانی پر کیے گئے مظالم کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں چشم دید واقعات درج ہیں۔

شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اٹھارہویں صدی کے مشہور صوفی ہیں۔ جس وقت شاہ ولی اللہ کی پیدائش ہوئی اس وقت مغل سلطنت زوال پذیر ہونی شروع ہوگئی تھی۔ ان کی تصانیف ''سیاسی مکتوبات'' اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' اہم ترین تاریخی ماخذ اہم ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات میں پہلا خط مغل بادشاہ و وزراء اور امراء کے نام ہے۔ اس میں انھوں نے سیاسی زوال اور اس کے اسباب کو قلم بند کیا ہے اور ملک کے اقتدار اعلیٰ بتایا ہے کہ کس طرح حالات کو درست کرنے کوشش کی جاسکتی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ''خالصہ'' کا علاقہ بڑھایا جائے تاکہ بادشاہ کو صوبے داروں اور جاگیرداروں کو اقتصادی غلامی سے نجات ملے۔ اس طرح ان کے دیگر مکتوبات میں بھی اس عہد کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے جو کہ تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔

غلام حسین طباطبائی:

غلام حسین طباطبائی نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد پیش آنے والے واقعات پر مبنی ''سیر المتاخرین'' تحریر کی۔ یہ فارسی ماخذ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یونس احمد نے کیا ہے۔ ''سیر المتاخرین'' ۱۶۹۸ء سے لے کر ۱۷۷۵ء تک کے حالات پر محیط ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس عہد کی تاریخ نویسی میں مدد ملتی ہے۔ یہ تصنیف مغلیہ عہد کے تاریخی ماخذ میں اہم ہے۔

نواب درگاہ قلی خاں:

درگاہ قلی خاں نے اٹھارہویں صدی کے دہلی میں رونما ہوئے سماجی اور تہذیبی حالات پر مبنی ''مرقع دہلی'' کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ بھی ایک فارسی ماخذ ہے۔ ''مرقع دہلی'' محمد شاہ رنگیلا

کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نادر شاہ درانی نے حملہ کیا تھا۔ اس کتاب میں ۱۷۳۸ء سے لے کر ۱۷۴۱ء تک کے واقعات درج ہیں۔ درگاہ قلی خاں دہلی میں ۱۷۳۸ء میں آئے تھے۔ تقریباً وہ دہلی میں تین سال اور چند ماہ رہے۔ ان سالوں میں انھوں نے دلی میں رہنے والوں کے سماجی و اقتصادی حالات کو قریب سے دیکھا۔ اس طرح یہ کتاب سیاسی اور اخلاقی زوال کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے معاشرے کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ ''مرقع دہلی'' اس عہد کی معاشرتی زندگی کے بارے میں جاننے کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس میں صوفیوں، مشائخ، مرثیہ گو، رقاصاؤں، بازاروں، عرس اور اس کے علاوہ دیگر پہلوؤں کے بارے میں بھی تفصیل سے معلومات فراہم ہوتی ہے۔

مرزا محمد حسین قتیل:

انھوں نے اس عہد کے معاشرتی حالات پر مبنی ''ہفت تماشہ'' تصنیف کی۔ یہ بھی فارسی ماخذ ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ محمد عمر نے کیا ہے۔ (قتیل ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن تیرہ سال کی عمر میں انھوں نے اسلام مذہب قبول کر لیا تھا) ''ہفت تماشہ'' میں تہواروں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کتاب سے اس عہد کی معاشرت، عوام کی روزمرہ زندگی اور ان کے جذبات وخیالات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ اہمیت کی حامل ہے۔ ہفت تماشہ، مرزا محمد حسین قتیل کی زندگی کے آخری سالوں کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں ہندوستانی دیو مالا کی روایات، جہلا اور عوام کے عقائد، عوامی رسمیں، نذر و نیاز، باہمی روابط وغیرہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ جن سے کہ اس دور کے معاشرے کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔

۱۱۔ ہم عصر شعراء

اس ضمن میں میر جعفر زٹلی، محمد شاکر ناجی، محمد رفیع سودا، میر تقی میر، قیام الدین، قائم چاند پوری، جعفر علی حسرت، میر حسن، شیخ غلام ہمدانی، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، محمد جعفر خاں راغب، شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ہم عصر شعراء کی شاعری کے مطالعہ سے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد کے بارے میں استفادہ کیا گیا ہے۔

میر جعفر زٹلی

میر جعفر زٹلی ۱۶۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ نارنول کے رہنے والے تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کے عہد میں ہوا۔ جعفر زٹلی کی شاعری سے جتنا اس وقت کے سیاسی و اخلاقی معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اتنا واضح کسی اور شاعر کے کلام سے نہیں ہوسکتا۔ ان کی شاعری کا انداز عموماً فطری تھا۔ ان کی شاعری کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر اس دور کی تاریخی اور سماجی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سے بھی زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ جعفر زٹلی اورنگ زیب کے عہد سے لے کر فرخ سیر کے زمانے تک کے چشم دید گواہ ہیں۔

میر جعفر زٹلی وسیع النظر شاعر تھے۔ جو کچھ کہنا ہوتا تھا بے دھڑک بنا کسی خوف کے کہتے تھے نہ تو وہ کسی امیر سے ڈرتے تھے اور نہ شہزادے یا بادشاہ سے۔

ان کی شاعری میں اس دور کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ انھوں نے اس عہد میں ہوئی سیاسی و اقتصادی پریشانیوں کا ذکر تفصیل سے اپنی شاعری میں کیا ہے اور سماج کے ہر طبقے کی طرف روشنی ڈالی ہے۔ جعفر زٹلی نے اخبارِ دربار شاہی کی تضمینوں میں جا بجا اس اخلاقی گراوٹ کا پردہ فاش کیا ہے۔ سیاسی ادبار، نظم و نسق کی خرابی، معاشرتی انتشار اور اخلاقی پستی وغیرہ پہلو جعفر زٹلی کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کے اہم موضوعات پند و نصیحت، کردار کی صالح خصوصیتوں پر زور، امراء کی کمزوریوں کی مذمت، اخلاقی گراوٹ کا اظہار اور آشوبیہ مضامین ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد کی تاریخ نویسی کے لیے اہم ترین ماخذ ہے۔

محمد شاکر ناجی

محمد شاکر ناجی کی شاعری ہم عصر عہد کے بارے میں جاننے کا بیش قیمتی ماخذ ہے۔ ناجی آبرو کے ہم عصر اور محمد شاہی دور کے شاعر تھے۔ محمد شاکر ناجی محمد شاہ کی فوج میں ایک سپاہی تھے۔ اس لیے ان کا بیان ایک چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اس عہد کے ہر ایک پہلو کی ترجمانی کی ہے۔ فوج میں ابتری اور جس طرح سے فوجیوں کو اقتصادی بدحالی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا بھی ذکر ہے۔ اس وقت دربار دہلی کا رنگ، شرفاء کی خواری، ہندوستانیوں کی

آرام طلبی اورناز پروری کوایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔

شیخ ظہورالدین حاتم

حاتم شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ان کی پیدائش ۱۶۹۸ء میں ہوئی اور ۱۷۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔حاتم ایک مردسپاہی پیشہ تھےاورمحمد شاہی دور میں عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی سرکار میں خدمت ندیمی پر متعین تھے۔حاتم کے ''مخمس شہرآشوب'' سے نادر شاہ کے حملے کے مابعد اثرات کا پتہ چلتا ہے۔اس شہرآشوب میں نچلے طبقے کی دولت مندی،عشرت پسندی اور آرام وآسائش کا مفصل بیان ملتا ہے۔اس طرح ان کی شاعری کے مطالعہ سے اس عہد کے معاشرتی وسیاسی اور دیگر حالات کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔انھوں نے بے حد پُراثر انداز میں معاشرتی حالات کوشاعری میں نمایاں کیا ہے۔اس عہد کی تاریخ نویسی میں حاتم کی شاعری کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''دیوان زادہ''شاہ حاتم کا مجموعہ کلام ہے۔

مرزامحمد رفیع سودا

سودا ۱۷۱۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مرزامحمد شفیع اورنگ زیب کے عہد میں تجارت کی غرض سے افغانستان سے دہلی میں آئے اوریہیں مستقیل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔

سودا کی زندگی جس دور میں بسر ہوئی وہ نہایت پُرآشوب زمانہ تھا۔سودا کے عہد میں ہی دلی بار بار اجڑی،کئی بادشاہ وامراء اپنے عہدوں سے برطرف کیے گئے۔ان تمام حالات کوانھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔سودا نے اپنے عہد کے سیاسی،اقتصادی اور معاشرتی زوال کا نہ صرف خودمشاہدہ کیا بلکہ اس کی لپیٹ میں خودبھی آئے۔امن وتحفظ اور روزگار کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے رہے۔ویسے تو سودافطرتاً ہنس مکھ طبیعت کے شخص تھے۔لیکن اس دور میں جوانتشار پھیلا ہوا تھا،ان حالات کا اثر سودا کے ذہن پر بھی پڑا۔

نادرشاہ درّانی کے حملے کے دوران دہلی میں جوتباہی وبربادی پھیلی سودا نے اس تباہی، بربادی کا تذکرہ شاعری میں نمایاں کیا ہے۔اس طرح سودا کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے اس عہد کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔سودا نے ''تضحیک روزگار'' میں ایک گھوڑے کی لاغری اورخرابیوں کا ذکر کیا ہے۔اس میں بظاہر کسی مخصوص گھوڑے کا ذکر ہے مگر درحقیقت سارے

معاشرے کی بدحالی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے شعراء، کاتب، کاشت کار، سوداگر، شیخ وغیرہ طبقات کی زبوں حالی کا ذکر شاعری میں کیا ہے۔ جس سے ان طبقات کی اقتصادی حالت کے بارے میں واقفیت ہوتی ہے کہ کس طرح مختلف طبقات اس عہد میں اقتصادی طور پر پریشان حال تھے۔ اس طرح مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سودا کی شاعری ایک بیش قیمتی ماخذ ہے۔

قیام الدین قائم چاندپوری

ان کا اصلی نام قیام الدین اور تخلص قائم تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷۲۵ء میں بمقام چاندپور ضلع بجنور میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد شاہی توپ خانے میں ملازمت اختیار کر لی اور احمد شاہ کے عہد تک ملازم رہے۔ چودہ یا پندرہ سال تک دہلی میں رہنے کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اس طرح قائم ایسے دور میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے بے حد انحطاط کا دور تھا۔ لیکن ادبی صورت حال قطعاً مختلف تھی۔ جہاں ایک طرف اس دور کا سیاسی انحطاط اپنی مثال آپ ہے وہیں دوسری طرف شعر و ادب کا عروج تھا۔ اس وقت کے پر آشوب حالات، سیاسی افراتفری اور معاشی تنگدستی کی صورت حال میں اردو زبان ارتقاء کی منزل طے کر رہی تھی۔ قائم کا شہر آشوب ''معرکہ سکھرتال'' جو کہ روہیل کھنڈ کی تباہی و بربادی کا مرثیہ ہے۔ ان کا دیوان ''مخزن نکات'' جو کہ اس عہد کے بارے میں جاننے کا بطور تاریخی ماخذ اہمیت کا حامل ہے۔ میر تقی میر کے شہر آشوب کی طرح سے ہی قائم کے شہر آشوب میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی عکاسی ہوتی ہے۔ انھوں نے ایسے بہت سے شہر آشوب لکھے جن سے معاشرہ کی تباہی و بربادی کا جو نقشہ سامنے آ جاتا ہے اس کے پس ہلکا سا ایک خاکہ نظر آتا ہے۔ جس کا تعلق لباس، مکان وغیرہ سے ہے جو کہ تہذیب و تمدن کے بارے میں جاننے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

میر تقی میر

میر کا اصلی نام محمد تقی تھا اور میر تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۲۳ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ میر ایسے دور میں پیدا ہوئے جب مغل حکومت زوال پذیر تھی اور زندگی کے ہر شعبہ میں انحطاط کا اثر پیدا ہو رہا تھا۔ میر نے اپنی زندگی کے نوے سال دلّی اور لکھنؤ میں بسر کئے۔ وہ اپنے دور کے حالات سے بہت حد تک متاثر تھے۔ اس دور کے حالات کی عکاسی ان کے کلام کے علاوہ ان کی

تصنیف ''ذکر میر'' میں بخوبی کی گئی ہے۔ میؔر نے اپنی غزلوں میں جا بجا اٹھارہویں صدی کے حالات کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف سیاسی زوال کو بیان کیا بلکہ اس عہد کے تہذیبی، سماجی اور اقتصادی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس طرح ان کی شاعری میں مغل بادشاہ کا عروج و زوال، لشکروں کی تخت وتاراج، شہروں کی بربادی و بدامنی، اقتصادی بدحالی، اخلاقی قدروں کی بےقدری، مرکزی حکومت کی بدنظمی، امراء وقت کی سیاست سے بےزاری اور ان کی اقتصادی بدحالی، فوجیوں کی آرام طلبی، اہل دربار کی سازشیں، سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی سرکشی اور بغاوتیں غرض کہ اس زمانے کے حالات کا ایک اشارتی نقشہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران دلی میں جو تباہی و بربادی پھیلی اس کا تذکرہ میؔر نے شاعری میں کیا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں سکھرتال کی لڑائی میں میر اس وقت راجے بہادر سنگھ کے مصاحب بنے ہوئے۔ شاہی لشکر کے ساتھ تھے۔ ان کے شہر آشوب، مثنویات اور ان کی غزلیں تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ میؔر کی شاعری میں زوال کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ میر کی خودنوشت سوانح حیات ''ذکر میر'' پورے چالیس سال کی تاریخ کے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے۔ ۱۸۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

میرؔ حسن

میر غلام حسن ۱۷۲۷ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۶۵ء میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں ایک سال گزارنے کے بعد فیض آباد آئے۔ اس زمانے میں فیض آباد اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ میر حسن کا کل سرمایۂ شعری ایک دیوان جس میں چھ قصیدے، غزلیات کا دیوان اور رباعیات شامل ہیں۔ گلزار رام اور سحر البیان ان کی اہم ترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ سحر البیان میں سماجی پس منظر اور شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا عہد صاف جھلکتا ہے۔ یہ ۱۷۸۴ء میں مکمل ہوئی۔ سحر البیان میں اس دور کی عصری معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔ میر حسن نے اپنے دور کی معاشرتی زندگی کا عکاسی کرتے ہوئے ماحول میں بعض خامیوں کو محسوس کیا۔ انھوں نے اصل زندگی کی تصویر کشی میں زندگی کا معیاری اور مثالی نمونہ سامنے رکھا۔ میر حسن

نے نہ صرف اس عہد کی جھلکیاں پیش کیں بلکہ معاشرے کے ساتھ ساتھ مثالی تصورات کو بھی پیش کیا ہے۔ رسوم وتزک واحتشام کا جو ذکر انھوں نے کیا ہے اس کی بنیاد ان کی ذاتی تجربہ کی آئینہ دار ہے۔ جو انھوں نے دربار دہلی اور اودھ دونوں جگہ دیکھا تھا۔ معاشرتی پہلو کے مدّنظر ان کی مثنوی ''سحرالبیان'' ایک اہم ماخذ ہے۔ اس طرح دربار کے مناظر، شادی کی رسومات، محلوں کی زندگی اور سائے کے حوالے سے بیان کرنے کا ڈھنگ میر حسؔن کے جذباتی ردّ عمل کا عکاس ہے۔ ''گلزار ارم'' میں انھوں نے لکھنؤ اور فیض آباد کے بارے میں اہم ترین تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس میں اپنے دلّی سے لکھنؤ تک کے سفر کو پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میر حسؔن کی شاعری اس عہد کے بارے میں جاننے کے لئے بطور ماخذ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ:

مصحفیؔ کا نام غلام ہمدانی اور والد کا نام ولی محمد تھا۔ ۱۷۴۸ء اور ۱۷۴۳ء کے درمیان امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا عہد اس ملک کی تاریخ میں ایک زوال پذیر عہد کی آخر تھا۔ مصحفیؔ کی شاعری تاریخی اعتبار سے سیاسی وسماجی انتشار کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری تہذیبی ومعاشرتی تضاد کی بھی عکاس ہے۔ مصحفیؔ کا دور وہ دور ہے جہاں دہلی کی شکست وریخت پر لکھنؤ کی تعمیر ہو رہی تھی ان کا زمانہ تاریخی اعتبار سے پُر آشوب تھا۔ مغل سلطنت زوال پذیر ہو رہی تھی۔ سلطنت کا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ دلّی اجڑ رہی تھی۔ قدیم روایتیں اور قدریں نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھیں۔ ان ہی کے زمانے میں شاہ عالم ثانی سلطنتِ دہلی کی جدوجہد میں تھے۔ مشرقی ہندوستان روہیل کھنڈ، اودھ، بہار اور بنگال چار حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ان کی تمام عمر شعر وشاعری میں گزری۔ وہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے فن کار تھے بلکہ فن شناس بھی تھے۔

جعفر علی حسرت:

جعفر علی حسرت ۱۱۵۰ھ میں شاہ جہاں آباد (دلی) میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ دور تھا جب دلّی میں مغل حکومت کی مرکزیت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے دو سماجوں اور دو درباروں (دلّی اور لکھنؤ) میں پرورش پائی۔ وہ دلّی میں احمد شاہ بادشاہ کے عہد تک رہے۔ اس طرح دلی کے

سیاسی حالات ابتر ہونے کے باعث جعفر علی حسرت دہلی سے فیض آباد اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے باعث دلّی میں جو تباہی و بربادی پھیلی تو ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے ''مخمس در احوال شاہ جہاں آباد'' لکھا۔ اس میں انھوں نے دلی کی برباد حالت کا تذکرہ پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے نہ صرف سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ دیگر طبقات کی اقتصادی زبوں حالی کا بھی ذکر انھوں نے کیا ہے۔ حسرت نے ایک اور قصیدہ ''در مدح امام علی موسیٰ رضا'' میں لکھا ہے۔ اس میں دہلی کی تباہی و بربادی کا ذکر بڑے دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ حسرت اپنے عہد اور اس کے اثرات کے پروردہ تھے۔ ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو اس وقت حسرت لکھنؤ آ گئے۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی کے تقریباً ہر شعبے کے باکمال فن کار اور علماء و فضلاء دہلی سے لکھنؤ میں آ کر جمع ہو چکے تھے۔ ان کی شاعری میں اس دور کے لکھنوی معاشرے کا بھی عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی:

نظیر اکبر آبادی ۱۷۳۶ء میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ ان کا کلام اس وقت کے سیاسی حالات، عام معاشرت اور رسم و رواج کے متعلق جاننے کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس طرح ان کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، مفلس و کنگال سب ہی کے حقیقت پر مبنی مرقع پیش کیے ہیں۔ مقامی پہلو کے سلسلے میں نظیر کی وہ نظمیں آتی ہیں جن میں مختلف تہواروں، تقریبوں اور میلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ہولی، دیوالی، راکھی، جنم کنھیا، کبوتر بازی، پتنگ بازی، تیراکی کا میلہ، عرس، حضرت شیخ سلیم چشتی وغیرہ اہم ہیں۔ اس طرح نظیر اکبر آبادی اپنی گرد و پیش کی زندگی کے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک شہر آشوب بھی لکھا جس میں انھوں نے متوسط طبقے اور خاص طور پر دستکاروں اور پیشہ وروں کی زبوں حالی کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس شہر آشوب میں چھتیس قسم کے مختلف پیشہ وروں اور دستکاروں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری حقیقی زندگی کی ترجمان ہے جس سے اس عہد کے روزمرہ کے مسائل اور عوامی زندگی کے بارے میں واقفیت فراہم ہوتی ہے۔

ان کی شاعری کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ہم عصر عہد کے ہر پہلو کا قریب سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے جس چیز کو جیسا پایا اسی طرح پیش کر دیا۔ عید، ہولی، بہار، آرسی، حقہ، سمدھن وغیرہ موضوعات پر انہوں نے غزلیں لکھیں۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ نویسی کے لیے نظیر اکبر آبادی کی شاعری بیش قیمتی ماخذ ہے۔

III۔ جدید مؤرخین

ویسے تو جدید مؤرخین کی فہرست طویل ہے مگر جن مؤرخین کی تصانیف سے خصوصی طور سے استفادہ کیا ہے ان میں سے کچھ مؤرخین کے نام اور ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

- W. Irvine, The Later Moghuls
- Jadunath Sarkar, The Fall of Mughal Empire,
- History of Aurangzeb.
- Satish Chandra, Parties and Politics at the Mughal Court, 1707-4 0
- Medieval India: Society, the Jagirdari Crisis and the Village.
- M. Athar Ali, The Mughal Nobility under Aurangzeb
- Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India.
- M. Alam, The Crisis of Empire in Mughal North India, Awadh and Punjab, 1707-1748
- Chetan Singh, Region and Empire, Punjab in the Seventeenth Century.
- Zahiruddin Malik, The Reign of Mohammad Shah.
- Mohd. Umar, Muslim Society in Northern India During the Eighteenth Century.

وغیرہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ''اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل ''اٹھارہویں صدی کے سیاسی حالات:

یہ باب اٹھارہویں صدی کے سیاسی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ اس باب میں اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سیاسی حالات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کے جانشینوں معظم، اعظم اور کام بخش کے درمیان ہوئی جنگ کا اور اس جنگ کے بعد اعظم اور کام بخش کا جو دردناک انجام ہوا تھا، اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان خطوط کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جو بہادر شاہ (معظم) نے اپنے بھائیوں اعظم اور کام بخش کو جنگ نہ کرنے کے لیے لکھے تھے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح مغل بادشاہوں کی سیاسی کمزوری کے باعث غیر ملکی

حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملے کیے۔ان حملوں میں خاص کر نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر کیا گیا ہے۔جس وقت یہ حملے کیے گئے اس وقت کے سیاسی حالات کا اور ان حملوں کے باعث جو اثرات ہندوستان پر اور خاص کر دلّی پر پڑے اور کس طرح سے احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے حملوں کے دوران دلّی میں جو تباہ و بربادی پھیلی، اس کا ذکر میر تقی میر کی تصنیف ''ذکر میر'' کے حوالے سے کیا گیا ہے۔نادر شاہ درّانی جو مال و اسباب ہندوستان سے لے گیا تھا اس کی طویل فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ باب کے آخر میں شاہ عالم ثانی کے عہد کے اہم واقعات اور غلام قادر روہیلہ نے جو مظالم شاہ عالم ثانی پر کیے تھے، اظفری کے حوالے سے اس واقعے کو بیان کیا ہے۔اس طرح ان تمام سیاسی حالات کو اس عہد کی شاعری کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب: نظریۂ بادشاہت، مغل بادشاہ اور ان کے امراء

اس باب کے شروع میں مغل نظریۂ بادشاہت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغلوں کا نظریۂ بادشاہت زوال پذیر ہو رہا تھا اور کس طرح سے اورنگ زیب کے جانشینوں نے مغل بادشاہت کے اصولوں کو نظر انداز کر دیا تھا اور کس طرح سے وہ سلطنت کے فرائض کے تئیں غافل ہو گئے تھے اس کے بعد شاہ عالم اول سے شاہ عالم ثانی تک کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اسی باب میں امراء کے کردار اور سلطنت کے تئیں ان کی غفلت شعاری کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مغل عہد کے ابتداء میں امراء جہاں مغل بادشاہوں کے ماتحت اور ان کے وفادار تھے۔لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغل بادشاہوں کی کمزوری کے باعث امراء بھی خودمختار ہو گئے تھے۔اور کس طرح دربار میں امراء کی گروہ بندیاں وجود میں آئیں، اس کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔باب کے آخر میں ان کے منفی کردار کو ہم عصر شعراء کی شاعری کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا باب: معاشی حالات

اس باب میں اٹھارہویں صدی کے معاشی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس عہد کے ہر طبقے جیسے امراء، فوجیوں، وکیلوں، شعراء، سوداگروں، کسانوں اور اس کے علاوہ سماج کے مختلف

طبقے کی اقتصادی بدحالی کا ذکر جعفر زٹلی، میر تقی میرؔ، سوداؔ اور جعفر علی حسرتؔ وغیرہ کی شاعری کے ذریعے سے کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس وقت معاشی حالات اتنے نازک ہو گئے تھے کہ مغل بادشاہوں تک کی معاشی حالت خراب تھی۔ جاگیرداری بحران کے باعث جو برے اثرات رونما ہوئے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اجارہ داری نظام کن وجوہات کی بنا پر وجود میں آیا، اس پر مختصر طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا باب: معاشرتی حالات

یہ باب اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد کے معاشرتی حالات پر مبنی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اعلیٰ حکمراں کے کردار کا اثر عوام پر کس طرح پڑ رہا تھا۔ معاشرے میں رقاصاؤں کو کس عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس عہد میں لوگ رسم و رواج کس پابندی کے ساتھ پورا کرتے تھے، اس کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ بازاروں میں معاشرے کا رجحان عام تھا چاندنی چوک اور سعد اللہ خان ان دو بازاروں کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ امرد پرستی، چھڑیوں، نذر و نیاز میں عقیدت، عرس اور صوفیوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پنجم باب:

اس باب میں پوری بحث کو اختصار کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔

☆☆☆

باب اوّل

اٹھارھویں صدی
کے
سیاسی حالات

باب اوّل

اٹھارہویں صدی کے سیاسی حالات

اورنگ زیب کے عہد آخر تک مغل سلطنت علاقائی وسعت کے اعتبار سے عروج کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد چند برسوں کے اندر ہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا۔ اس پرآشوب زمانے میں سلطنت مغلیہ کے چپے چپے پر بغاوتیں ہورہی تھیں، ایک معمولی سردار بھی ہندوستان پر بادشاہت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت عروج پر تھی، بھرت پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹ سر اٹھارہے تھے۔ اودھ میں روہیلے اپنی مضبوط ریاست بنا چکے تھے، مگر ان میں سب سے زیادہ طاقت مرہٹوں نے حاصل کرلی تھی، جو اس وقت برار سے سندھ تک پھیلے ہوئے تھے۔ میر تقی میر نے اس عہد کی سیاسی صورت حال کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

چور اُچکے، سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے، فقر ہی اک دولت ہے اب(۱)

مغل بادشاہوں کی سیاسی کمزوری کے باعث سلطنت کے بااقتدار امراء نیم آزاد حکومتوں کو قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے "بادشاہ ہنگامہ ہای ناؤنوش میں مدہوش اور عیش و عشرت میں غرق تھے۔ ان کے چاروں طرف امراء کی سازشوں کا ہولناک جال بچھا ہوا تھا، صوبوں میں خودمختاریاں اور نوابیاں قائم ہورہی تھیں، سارا ملک سیاسی نبردآزمائی اور کشمکش کا

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۱ء، ص ۵۴۸

بازیچہ بن گیا تھا، پارٹی بندی کے مسموم اثرات محلات سے گزر کر عوام کی زندگی میں تلخی پیدا کر رہے تھے" (۱)۔ اس عہد میں یہ نوبت آ گئی تھی کہ تیزی کے ساتھ بادشاہ پر بادشاہ بدل رہے تھے۔ تخت نشین ہونے والے بادشاہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی بادشاہت کتنے دن قائم رہے گی۔ ہر مرتبہ جب ایک بادشاہ مرتا اور اس کی جانشینی کی جنگ کو جیت کر جو شہزادہ بادشاہ بن جاتا وہ اپنے درباریوں کو شک بھری نظروں سے دیکھتا۔ جب بادشاہوں کی طاقت کم ہو گئی تو صوبوں کے گورنر طاقت ور بن گئے۔ جعفر زٹلی کے مطابق دربار کی صورت حال کچھ ایسی تھی۔

دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا

ٹکڑا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا حظ ہے (۲)

تارا چند کے مطابق "اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کا ہندوستان مشہور سیاسی مفکرین ہابس کے فلسفۂ فطرت کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے، یہ ایک جنگل کی مانند تھا، جس میں خوفناک اور حیوان صفت انسان چاروں طرف گھومتے تھے اور جن کے لئے محرک جذبات صرف گہری خود غرضی اور طاقت کے لئے غیر معمولی تنگ نظرانہ حرص تھی، ان کی روک کے لئے نہ کوئی اخلاقی نقطہ نظر تھا اور نہ ان کے پاس دور اندیشانہ مقاصد تھے (۳)۔

اس طرح اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں سلطنت کا ڈھانچہ ٹوٹنے لگا تھا اور جس طرح سے اس صدی کا زمانہ آگے بڑھتا گیا مغل سلطنت کے زوال کی رفتار تیز ہو گئی، مرکزی حکومت کی کمزوری کا اثر بطور ردعمل کے حکومت کی مالیاتی زندگی پر پڑا، رسل و رسائل میں دقتیں واقع ہوئیں۔ صنعت و حرفت مقامی طور پر محدود ہو گئے۔ مرکزی حکومت اور اس کے اداروں کے ٹوٹنے سے جو انتشار پھیلا اس نے لوگوں کی سماجی و ثقافتی رویوں کو تبدیل کر دیا۔ جس کی وجہ سے مرہٹہ، روہیلہ، جاٹ اور راجپوت ابھرتے آخر کار اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر انگریز اقتدار

(۱) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی (ذکر میر)، مترجمہ نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷، ص ۱۲۹

(۲) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹، ص ۱۴۴

(۳) تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد اول، مرتبہ قاضی عدیل عباسی، دہلی، ۱۹۸۰، ص ۸۲

میں آ گئے۔ جعفر علی حسرت کے مطابق:۔

کہاں سے دیجئے طلب اب کہاں خزینا ہے
کہ لال قلعہ میں اب تو کہاں دفینا ہے
مرا بھی کہہ تو کہاں سے بھلا مہینا ہے
جو ملک تھا سو مرا سرکشوں نے چھینا ہے
جو تجکو لکھ دوں میں پروانہ مانیں کب عمال (۱)

میر تقی میر کا اس عہد کے بارے میں کہنا ہے:۔

اس عہد کو نہ جانئے اگلے سا عہد میر
وہ دور اب نہیں وہ زمین آسمان نہیں (۲)

اورنگ زیب نے حکمت عملی سے اور تدبیر سے کام لے کر اس زوال کو نمایاں نہیں ہونے دیا تھا لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد زوال کی رفتار تیز ہوگئی کہ دس سال کے عرصے میں تخت کی وراثت پر سات بار لڑائی ہوئی۔ محمد عمر کا کہنا ہے کہ ''۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگزیب کا انتقال ہوا تو گویا حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک طرف تخت نشینی کی جنگوں نے سیاسی نظام کو متزلزل کر رکھا تھا، دوسری طرف اورنگزیب کے جانشینوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پسندی، اور پست ہمتی نے حالات کو نازک سے نازک تر اور بد سے بدتر بنا رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی طاقت آپس ہی میں لڑ کر ختم کر دی تھی اور بیرونی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی تاب باقی نہیں تھی (۳)۔ چند کہ اورنگزیب نے اپنی وسیع سلطنت اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی وفات کے فوراً بعد شہزادے جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنو، ۱۹۶۶، ص ۵۶
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۲۹۰
(۳) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲

اورنگزیب کے جانشینوں کے مابین وراثت کی جنگ:

سیر المتاخرین اور منتخب اللباب کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان معظم (شاہ عالم اول) نے اپنے بھائیوں کو جنگ نہ کرنے کے لئے مکتوب لکھے۔

شاہ عالم کا خط اعظم شاہ کے نام:

"اگر تم دکن جیسے وسیع و عریض ملک پر قانع رہو اور باپ کے بخشے ہوئے اتنے بڑے خطے سے آگے نہ بڑھو، یعنی تخت دہلی پر حریصانہ نگاہ نہ ڈالو اور الصلح جبراً نظر مطمئن رہو اس رویے سے صرف تم کو بے شمار فوائد پہنچیں گے، بلکہ میری دعائیں بھی تمہارے ساتھ شامل رہیں گی"

لیکن سلطان معظم کی یہ دل نشین باتیں اعظم شاہ کے دل پر اثر انداز نہ ہوسکیں، کیونکہ وہ اپنے دست و بازو اپنی صلاحیت و اہلیت اور اپنے خیالات و کمالات پر کامل اعتماد رکھتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے مکتوب کا جواب مختصر الفاظ میں دیا۔

"دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" ایک ہی ملک میں دو بادشاہوں کا فرمان روا ہونا ممکن نہیں) (۱)

اورنگزیب کی وفات کے بعد اس کے تینوں بیٹوں (معظم، اعظم اور کام بخش) کے درمیان تخت نشینی کے لئے جنگ ہوئی۔ جیسا کہ مغل عہد میں ابتداء سے ہوتا آیا ہے معظم نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو درخواست کی کہ جنگ نہ کریں والد کی وصیت کے مطابق چلیں جیسا کہ اس کے خط سے واضح ہے لیکن اس کے بھائیوں نے جنگ کرنے کی ہی ٹھانی ہوئی تھی اور نگ زیب کے بعد جانشینی سے متعلق جنگیں بہادر شاہ جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے زمانے تک ہوئیں اسکے بعد تخت نشینی کے لئے جنگوں کا خاتمہ ہو گیا اور بادشاہ بنانے کا اختیار امراء کے ہاتھوں میں آ گیا، اب ہر ایک

---

(۱) غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، مترجم یونس احمد، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵
خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، مترجم محمد احمد فاروقی، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۳۵ تا ۳۷

شہزادے کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان امراء کو خوش کر کے بادشاہ بن جائیں۔

جاجو کی جنگ: اعظم شاہ اور معظم کے درمیان (۱۸ جون ۱۷۰۷ء):

معظم اور اعظم شاہ کے درمیان ۱۸/ جون ۱۷۰۷ء کو جاجو کے میدان میں وراثت کے لئے جنگ ہوئی۔ مولوی بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ اورنگزیب کا مرنا تھا کہ اس کا بیٹا شہزادہ معظم کابل سے پر لگا کر آن پہنچا اور آگرے کے قریب موضع جاجو اسی مقام پر جہاں پر اس کے باپ نے دارا کو شکست دی تھی، اپنے بھائی شہزادہ محمد اعظم شاہ صوبہ دار دکن سے بڑی بڑی بھاری لڑائی ہوئی دونوں طرف کے لوگ ملا کر ۶۵۰۰۰۰ کہے جاتے ہیں نتیجہ اس لڑائی میں شہزادہ معظم کو فتح ہوئی (۱) اس جنگ میں اعظم شاہ کی فوجی حالت بہ نسبت معظم کے اچھی نہیں تھی معظم آگرے کے قلعے سے کچھ بھاری توپیں بھی لایا تھا جو کہ اعظم شاہ کے پاس نہیں تھیں۔ اس جنگ میں اعظم شاہ دو سو تین سو ساتھیوں کے ساتھ آخر دم تک لڑتا رہا۔

> خافی خاں کے مطابق ''اعظم شاہ کے اطراف دو سو تین سو سے زائد فوج نہیں رہی تھی۔ وہ دشمن کی ہزار دو ہزار فوج کے درمیان گولہ باری اور تیروں کی زد میں خود کو پا رہا تھا چیخ کر کہا'' شاہ عالم مجھ سے جنگ نہیں کر رہا ہے، بلکہ میرا خدا اور میرا نصیبہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا (۲)

جعفر زٹلی نے مندرجہ ذیل شعر میں ان واقعات کی اس طرح عکاسی کی ہے:

ازاں سو اعظم وزیں سو معظم

جھڑا جھڑ اور دھڑا دھڑ ہر دو باہم (۳)

اس طرح مورخین کے علاوہ جعفر زٹلی واحد اہل قلم ہے جنہوں نے ان واقعات و سانحات کی تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے میدان جنگ کا نقشہ مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح

---

(۱) مولوی بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، حصہ اول، دہلی، ۱۹۱۹ء، ص ۶۱۷ تا ۶۱۹

(۲) خافی خاں، منتخب اللباب، مترجم محمد احمد فاروقی، کراچی، ۱۹۲۳ء، ص ۴۷

(۳) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۶

پیش کیا ہے۔

اعظم(۱) معظم بھاگ رے آ کر نرے پھر آ گرے
لشکر میں بھاگا بھاگ رے آخر فنا آخر فنا

لڑتے بہادر شاہ ہیں، چاروں بیٹے ہمراہ ہیں
وہ جگ منے گمراہ ہیں، آخر فنا آخر فنا

رن میں معز الدین (۲) ہنستے ہنس لڑائی میں دھنسے
لوہو کی ندی میں پھنسے، آخر فنا آخر فنا

لڑتا رفیع القدر (۳) ہے، وہ آسمان میں بدر ہے
شہزادوں میں وہ صدر ہے آخر فنا آخر فنا

چارم خجستہ اختر (۴) است برندہ شمشیر بدست
غرندہ ہمچوں فیل مست؟ آخر فنا آخر فنا

جاجو پراب مار ہے برسے جو لوہا دھار ہے
اعظم اجل سردار ہے، آخر فنا آخر فنا

---

(۱) محمد اعظم ۱۸ر جون ۱۶۵۳ کو شاہنواز خاں صفوی کی لڑکی دلرس بیگم کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ۳۱ر جولائی ۱۶۸۱ کو اسے شاہ عالم کا خطاب دیا گیا۔ ۲۵ر جنوری ۱۶۸۶ کو اسے شنبھاجی کے مقابلے پر بھیجا گیا تھا۔

(۲) جہاندار شاہ

(۳) رفیع القدر شاہ عالم بہادر شاہ کا بیٹا تھا۔ تخت نشینی کے بعد شاہ عالم نے اسے رفیع الشان کا خطاب دیا تھا۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد ذوالفقار خاں نے اسے شہزادہ عظیم الشان کے خلاف جہاندار شاہ کی طرف کر لیا تھا۔ عظیم الشان کی شکست کے بعد ذوالفقار خاں نے دھوکہ سے اس پر حملہ کیا اس حملے میں وہ مارا گیا۔ جہاندار شاہ نے اس کی اور اس کی بیٹیوں اور بیبیوں کی لاشوں کو تین دن تک ریت میں برہنہ پڑی رہنے دی تھیں۔

(۴) خجستہ اختر شاہ عالم بہادر شاہ کا بیٹا تھا۔ تخت نشینی کے بعد اسے جہاں شاہ کا خطاب ملا تھا۔ بہادر شاہ کی موت کے بعد خانہ جنگی میں جب جہاندار شاہ میدان چھوڑ چکا تھا، ذوالفقار خاں کے فوجیوں نے اچانک نمودار ہو کر اس کی فوج پر گولہ باری کی جہاندار شاہ کی شکست فتح میں بدل گئی اور خجستہ اختر مارا گیا۔

بیدار (۱) جس کا بخت ہے کرتا جو لوہا سخت ہے
ناہیں تصیبوں تخت ہے آخر فنا آخر فنا

سارے امیر آ کر گئے ہو دی لہو سے بھر گے
سا کھا جگت میں کر گئے آخر فنا آخر فنا

جب فتح ہو گئی شاہ کی، بازی ہوئی گمراہ کی
اب تو رضااللہ کی، آخر فنا آخر فنا
یہ شہ عجب گمراہ ہے، منعم و زیر شاہ ہے
نہ زور نہ تنخواہ ہے، آخر فنا آخر فنا(۲)

نجم الغنی کا کہنا ہے کہ ''جنگ وجدل کے کشت وخون سے بدتر حال ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے عہد کا درج نہیں ہوا ہے۔اعظم شاہ اور اس کے بیٹے بیدار بخت نے ہلاک ہو کے اپنے دعوے کو ختم کیا''(۳)

اعظم شاہ کا دردناک انجام:

درحقیقت اعظم شاہ کو اپنی کامیابی کی پوری امید تھی ،لیکن آخر کار وہ اس جنگ میں مارا گیا اور اس کا انجام بے حد دردناک ہوا۔جس کا ذکر خافی خان نے ان الفاظ میں کیا ہے''

رستم علی خاں محمد اعظم شاہ کے سر کو لے کر بہادر شاہ (شاہ عالم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔اور دامن کے نیچے سے سر نکال کر پہلے اپنے ناپاک دانتوں سے اعظم شاہ کے خون آلود رخسار کو بڑے جوش وغضب کے ساتھ کاٹ لیا، پھر اس کو شاہ عالم کے ہاتھی کے پاؤں میں ڈال دیا۔

---

(۱) محمد اعظم شاہ کا لڑکا تھا
(۲) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی ،مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد علی گڑھ ۱۹۷۹ ،ص ۱۶۸ تا ۱۷۱
(۳) نجم الغنی ،تاریخ ریاست حیدرآباد دکن، حصہ اول ،نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ ،ص ۶۸

شاہ عالم نے جب اس سنگ سرشت وحشی بھائی کے رخسار کو اس طرح
کاٹتے ہوئے دیکھا تو غضبناک ہو گیا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر
آئے''(۱)

شاہ عالم اور کام بخش (۲):

اورنگزیب کی وفات کے بعد کام بخش دین پناہ کے لقب سے تخت نشین ہو چکا تھا۔ اور اس نے سکوں پر فارسی میں مندرجہ ذیل شعر کندہ کروایا۔

در دکن زد سکہ بر خور شید و ماہ
پادشاہ کام بخش دینِ پناہ (۳)

اس طرح وہ بھی اعظم شاہ کی طرح سے پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ معظم نے کام بخش کو بھی جنگ نہ کرنے کی غرض سے ایک خط لکھا۔ جو اس طرح ہے۔

شاہ عالم کا خط کام بخش کے نام:

والد بزرگوار نے صوبہ بیجاپور کی حکومت تم کو عطا کر دی تھی،
ہم بیجاپور اور حیدرآباد دونوں صوبوں کی حکمرانی بشمول
توابعات ولواحقات اس عالی قدر بھائی کے تفویض کرتے
ہیں بشرطیکہ وہ دکن کے سابق فرمان رواؤں کے طریقہ پر
ہمارے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دے۔ جو پیش کش زمانہ
قدیم سے ان دونوں صوبوں کے حکام بادشاہی سرکار میں جمع

---

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۴۷ تا ۴۸

(۲) محمد کام بخش ۲۴ر فروری ۱۶۶۷ کو رانی اودے پور کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۶۸۶ میں اسے خلعت خاصہ اور اسپ مرصع دیا گیا اسے دوبار نظر بند کیا گیا۔ ایک بار راجہ رام جاٹ سے ساز باز کرنے کے الزام میں اور دوسری بار اورنگ زیب کی حکم عدولی کی سزا میں۔ ۳ر جنوری ۱۷۰۹ کو تخت نشینی کی جنگ میں لڑتا ہوا مر گیا

(۳) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، مترجم محمد احمد فاروقی، کراچی ۱۹۲۳، ص ۲۳

> کراتے رہے ہیں ہم اس کی معافی عطا کرتے ہیں اس عنایت و مرحمت پر حسب آیت ''فان شکرتم لازیدنکم'' (اگر تم شکر بجالاؤ تو ہم تم کو زیادہ دیں) تم دل و جان سے شکر بجالاؤ اور اپنے بزرگوں کی طرح عدل پروری داوگستری اور رعایا کے ساتھ حسن سلوک کو اختیار کرو۔ اور اس علاقہ کے سرکشوں ظالموں اور راہزنوں کی سرکوبی سے غفلت نہ برتو'' (۱)

لیکن کام بخش نے اس خط کا جواب ترش آمیز لہجہ میں دیا۔ اور اپنی بغاوت کو جاری رکھا۔ جعفر زٹلی نے کام بخش کے متعلق لکھا ہے:

یہ کام بخش کمبخت تھا، امراء کشی کو سخت تھا
وہ بھی عجائب رخت تھا آخر فنا آخر فنا (۲)

اس طرح آخر کار شاہ عالم کو نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ کرنی پڑی۔ اس جنگ میں کام بخش کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کام بخش اور اس کے دو بیٹوں کو جو بہت زخمی تھے بہادر شاہ (شاہ عالم) کے ڈیرے میں رکھا گیا۔ بہادر شاہ فطرتاً بے حد نرم مزاج تھا۔ جب کام بخش جنگ میں بری طرح زخمی ہو گیا تو اس نے اس کے علاج کے لیے یونانی جراحوں کو مقرر کیا یہی نہیں بلکہ اس کو دیکھنے کے لیے رات اس سے ملنے بھی گیا۔ اس نے کام بخش سے کہا کہ ''ہم تمہیں اس حال میں تو نہیں دیکھنا چاہتے تھے'' کام بخش نے جواب دیا ''میں نہیں چاہتا تھا کہ بے عزتی کے ساتھ گرفتار ہو کر تیموری اولاد پر رسوائی کا داغ لگاؤں'' (۳)۔ تین پہر کے بعد کام بخش اور اس کا بیٹا چل بسا۔ اس طرح جنوری ۱۷۰۹ میں کام بخش کی وفات کے بعد اورنگ زیب کے جانشینوں میں تخت نشینی کی جنگ ختم ہوئی جس کی وجہ سے دو سال تک سلطنت میں

---

(۱) خافی خاں، منتخب الباب، حصہ چہارم، مترجم محمد احمد فاروقی، کراچی ۱۹۲۳، ص ۵۷
(۲) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹، ص ۱۷۱
(۳) غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، اردو ترجمہ، یونس احمد، کراچی، ۱۹۶۸، ص ۲۴

اوتھل پتھل رہی۔

جس وقت بہادر شاہ (۱۷۰۷) تخت نشیں ہوا اس کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ اورنگ زیب کی پالیسیوں کے باعث راجپوت، مرہٹے، جاٹ اور سکھ مغل سلطنت کے کٹر دشمن بن گئے تھے۔ بہادر شاہ نے سب سے پہلے اپنا دھیان راجپوتوں کی طرف کیا۔ مارواڑ (جودھپور) کے راجپوت حکمراں اجیت سنگھ نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں میں ہونے والی جنگ کا فائدہ اٹھا کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مغل صوبہ اجمیر پر بھی حملہ کر دیا۔ بہادر شاہ نے جودھپور پر حملہ کر کے اجیت سنگھ کو شکست دی۔ لیکن بعد میں بہادر شاہ نے اسے معاف کر دیا۔ مرہٹوں کو دکن کی سردیش مکھی کا اختیار دے کر ان سے میل ملاپ کرنے کی اس نے کوشش کی، اس کے علاوہ اس نے سکھوں سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی۔ گرو گووند سنگھ کو پانچ ہزار کا منصب دیا۔ لیکن ۱۷۰۸ میں سکھوں نے بندہ بہادر کی قیادت میں پنجاب میں مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ بہادر شاہ نے اس بغاوت کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسی دوران ۱۷۱۲ میں اس کی وفات ہو گئی۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے چار بیٹوں میں پھر سے تخت نشینی کے لیے جنگ شروع ہو گئی اروِن کا کہنا ہے کہ ''چار بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ بسترِ مرگ پر تنہا تھا اور تخت و تاج کے جھگڑے میں اس کی لاش ایک مہینے تک لاہور میں پڑی رہی''۔ جعفر زٹلی نے اس عہد کے انتشار کو مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح نمایاں کیا ہے:

صدائے توپ و بندوق است ہر سو
بہ سرا سباب و صندوق است ہر سو

کٹاکٹ و لٹالٹ است ہر سو
جھٹا جھٹ و پھٹا پھٹ است ہر سو

بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است ہر سو
او چل چال و تبر خنجر، کٹار است (۱)

محمد معزالدین جہاندار شاہ اپنے تینوں بھائیوں کو شکست دے کر تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں امورِ سلطنت کا دارومدار ذوالفقار خاں پر تھا۔ غرض اس عہد میں سیاسی حالات حد سے زیادہ نازک ہو گئے غرض کہ اورنگ زیب جیسے جفاکش اور دیندار حکمراں کے کاہل بیٹے اور عیاش پوتے (جہاندار شاہ) کی وجہ سے اس کی وفات کے چھ سال بعد ہی مغل سلطنت کی حالت خراب ہوگئی۔ عوام میں اخلاقی پستی، بے مروتی عام ہوگئی۔ جعفر زٹلی نے ان حالات کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھیوں میں وفاداری
محبت اوٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے (۲)

ان حالات میں ملک کی تمام دبی ہوئی سیاسی قوتوں نے قسمت آزمائی شروع کر دی۔ مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹ سب اس پراگندہ سیاسی ماحول کا فائدہ اٹھا رہے تھے اور ملک سے امن و امان رخصت ہو چکا تھا۔

نادر شاہ کے حملے کے وقت سیاسی حالات-۱۷۳۹ء:

جس وقت ہندوستان پر نادر شاہ درانی نے حملہ کیا اس وقت ہندوستان کی سیاسی

(۱) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۶
(۲) ایضاً.................................. ص ۱۳۵

حالت بے حد خراب تھی، اگر اس وقت اورنگ زیب جیسا بادشاہ تخت نشیں ہوتا تو ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے کئی بار نادر شاہ سوچتا، لیکن مغل سلطنت کے کھوکھلے پن نے نادر شاہ کے حوصلوں کو اور بھی بڑھاوا دیا۔ بدنظمی اور انتشار نے سیاسی حالات کو حد درجہ بگاڑ دیا تھا۔ اس وقت مغل دربار گٹھ بندی کا شکار تھا اس طرح ہر ایک گٹھ اپنے مفاد کے مدِنظر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر سعادت برہان الملک (۱) نے امیر الامراء کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے نادر شاہ کو دلی بلا کر قتل عام کرایا۔

نادر شاہ کے حملے کے وقت محمد شاہ رنگیلہ تخت نشین تھا۔ اس کا دربار اکبر و عالمگیر کا دربار نہیں جہاں امورِ سلطنت طے ہوتے تھے اس وقت نہ سلطنت رہی تھی اور نہ ہی امور دربار میں فقرہ بازی اور لطیفہ گوئی پر ہر ایک امیر بادشاہ کو ایسی باتوں سے لبھانے کی کوشش کرتا۔

صمصام الدین شاہنواز نے لکھا ہے کہ ''جب محمد شاہ بادشاہ کی حکومت کا زمانہ آیا تو گردش چرخ نے بادشاہ کی رضاعی بہن جو بہت زبان آور اور خوش تقریر عورت تھی مزاج شاہی میں پوری طرح سے دخیل کر دیا اور شاہی معاملات اس کے ہاتھوں طے کرانے لگا۔ اس نے مرتبہ شناسی اور ضابطہ دانی کو چھوڑ دیا جو کوئی اس کے پاس آتا وہ اس سے بادشاہ کی پیشکش کو کہ نذرانے اور اپنے حق المحنت کے نام سے رقم لے لیا کرتا تھا۔ بادشاہ مذکور (محمد شاہ) کے زمانے میں اس کے القاب میں ''یار وفادار'' کا اضافہ ہوا۔ (۲)

جب نادر شاہ نے حملہ کیا تو اس وقت محمد شاہ رنگیلہ اپنی سیاسی کمزوری کے باعث اس کے طوفانی حملے کو نہیں روک سکا نتیجتاً دلی تباہ و برباد ہو گئی بادشاہ کی اس بزدلی سے نہ صرف فوج

(۱) اودھ کی صوبہ داری پر مامور تھا

(۲) صمصام الدین شاہنواز، ماثر الامراء، جلد دوم، مترجم پروفیسر محمد ایوب قادری، لاہور، ۱۹۸۱، ص ۳۲۸

بلکہ رعایا بھی بددل ہوگئی۔

نادر شاہ کا حملہ اور دلی کی تباہ و بربادی:

نادر شاہ کے حملے نے دلی کے سیاسی حالات کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ اس حملے کی وجہ سے دلی میں جو تباہ و بربادی پھیلی اس کا ذکر غلام حسین طباطبائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''نادر شاہ کے سپاہیوں نے گھر میں گھس کر نہ صرف لوٹ مار مچائی بلکہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ مقتولین کی بیویوں اور بیٹیوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے بھاگے متعدد مکانوں میں آگ لگا دی دوپہر ہوتے ہوتے جب مقتولین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو نادر شاہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی سپاہیوں کی شمشیریں نیام کے اندر چلی گئیں سڑی گلی لاشوں سے کئی روز تک ایسا تعفن پھیلا کہ شہروں کی زندگی بکھر کر معطل ہوگئی اکثر مقامات پر تو آمد و رفت قطعی بند ہوگیا تھا چنانچہ کوتوال شہر کو حکم ملا کہ لاشیں ایک ایک دفن کر دی جائیں اور سڑکوں کی صفائی ستھرائی کی جائے لیکن کوتوال نے لاشوں کو ایک جگہ جمع کر کے اور تمیز کئے بغیر کہ کون کافر ہے اور کون مسلمان آگ لگا دی'' (۱)

مرزا رفیع سودا نے دلی کی تباہ و بربادی کو ان اشعار اسطرح نمایاں کیا ہے۔

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گذار
نہ وہ گل ہی نظر آیا، نہ وہ گلشن نہ بہار

نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اڑتی ہے، ہر اک سمت پڑے ہیں خس و خار

---

(۱) غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۲۳۳

مسکراتا تھا جہاں غنچۂ و گل ہنستا تھا
اشک شبنم کے بھی قطرہ کا نہیں واں آثار

جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے، سرو شمشاد
مشت پر قمری کے اس جانظر آئے اک بار

دیکھتا کیا ہوں مگر، سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے، بے بال و پر ودل افگار

بدم سرو و بصد حسرت و صد سوز جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ زار

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد (۱)

مولوی بشیرالدین احمد نے لکھا ہے کہ جوہری بازار سے پرانی عیدگاہ تک اور جامع مسجد کے پاس چتلی قبر سے لیکر تیلی واڑی کی منڈی میں مٹھائی کے پل تک قیامت بپا تھی۔ صبح کے آٹھ بجے سے شام کے تین بجے تک مسلسل لوٹ مار و غارت گری اور قتل کا بازار گرم تھا محمد شاہ نے اپنا سفیر نادرشاہ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ جا کر عذر معذرت کرے تب کہیں جا کر قتل سے ہاتھ رکا مگر جبکہ ایک لاکھ سے اوپر جانیں تہ تیغ ہو چکی تھیں جن میں آٹے کا ساگھن بھی پس گیا اور بہت سے ناکردہ گناہ مرد عورتیں بچے بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے تیرہویں تاریخ پھر شورش بپا ہوئی مگر کم شہر کی گلیاں مردوں سے اٹ گئی تھیں جہاں دیکھو لعشوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ شہری مسجد کے گرد کئی برس تک پرندہ پر نہیں مارتا تھا اور ایسا بھیانک سماں تھا کہ آدمی پاس نہ بھٹکتا تھا'' (۲)

---

(۱) مرزا محمد رفیع سودا، کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲، ص ۴۴۶ تا ۴۴۷
(۲) مولوی بشیرالدین، واقعات دارالحکومت دہلی، جلد اول، ص ۶۴۳

نادر شاہ درّانی ہندوستان سے جو نقد روپیہ اور قیمتی اشیا لے گیا تھا اس کی تفصیل مولانا محمد نجم الغنی اس طرح پیش کی ہے:

نمبر	تفصیل	مالیت
۱۔	خاص بادشاہی خزانوں سے	ساڑھے تین کروڑ روپیہ
۲۔	جواہر خانہ خاص سے جواہر۔	قیمتی پندرہ کروڑ روپیہ
۳۔	مرصع اور سونے چاندی کے برتن۔	قیمتی ڈیڑھ کروڑ روپیہ
۴۔	تخت طاوس وتخت رواں۔	قیمتی تین کروڑ روپیہ
۵۔	اسباب سلاح خانہ وفراش خانہ آبدار خانہ وخوشبودار خانہ وباورچی خانہ وکرا کری خانہ وزین خانہ۔	تخمینا پندرہ کروڑ روپیہ
۶۔	شاہی ہاتھی خانے سے...........	۵۰۰ ہاتھی
۷۔	شاہی اصطبل سے......	۲۰۰۰ گھوڑے
۸۔	نواب مظفر خاں وخاندوران خان کا وہ مال واسباب وزر نقد جو میدان جنگ میں ان کے لشکرگاہوں کی لوٹ سے ملا اسی طرح برہان الملک کی لشکرگاہ کا مال واسباب اور دلی میں جو برہان الملک سے زر نقد ملا	سات کروڑ روپے سے زیادہ کا
۹۔	اہلکاروں، امیروں، سوداگروں اور سرداروں سے......	دو کروڑ بر دو لاکھ روپیہ
۱۰۔	آصف جاہ سے........	ایک کروڑ روپیہ
۱۱۔	اعتماد الملک قمر الدین خاں وزیر اعظم سے	ایک کروڑ روپیہ
۱۲۔	لطف اللہ خان سے.......	ایک کروڑ روپیہ

۱۳۔ نواب محمد خاں بنگش والی فرخ آباد سے.....	نولاکھ روپیہ
۱۴۔ رائے خوش حال چند پیشکار بخشی گری سے........	پونے تین لاکھ
۱۵۔ شیخ سعد اللہ دیوان تن سے........	اڑھائی لاکھ روپیہ
۱۶۔ ناگرمل دیوان خالصہ سے........	ساڑھے تین لاکھ روپیہ
۱۷۔ سیتارام خزانچی خزانہ عامرہ سے......	تین لاکھ روپیہ
۱۸۔ جگل کشور سے........	اڑھائی لاکھ روپیہ
۱۹۔ سجان رائے وکیل افاغنہ دکن سے.....	ڈیڑھ لاکھ روپیہ
۲۰۔ رائے نوندرائے پیشکار خالصہ سے......	پونے تین لاکھ روپیہ

اسی طرح دوسرے اکابر علماء وفضلا وقاضی القضات میں سے کسی کو نہ چھوڑا سب سے روپیہ وصول کیا۔ ان لوگوں پر سزاول اور چوبدار اور سپاہی نہایت سخت مزاج مسلط کیے جن سے خدا کی پناہ جو لوگ استطاعت اس قدر روپے دینے کی رکھتے تھے جس قدر ان سے مانگا جاتا تھا تو وہ ان میں سے کسی نے زہر کھالیا، کسی نے ہتھیار سے خودکشی کر لی۔(۱) اسی طرح مرقع دہلی میں نادر شاہ کے ذریعے سے لے جانے والی دولت کا تذکرہ ملتا ہے "نقد روپیوں کے علاوہ کڑوروں کی مالیت کے سونے چاندی کے برتن جواہرات اور دوسرا سامان اسکے ہاتھ آیا تخت طاؤس اور کوہ نور جیسی نادر اور بیش بہا اشیاء بھی اس کے خزانے میں منتقل ہوگئیں۔(۲)

حملے کے اثرات:

نادر شاہ درانی کے حملے کی وجہ سے دہلی کی مرکزیت پہلے سے بھی اور زیادہ کمزور ہوگئی تھی شاہی خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ پورا ہندوستان ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ مشرقی

(۱) نجم الغنی، تاریخ ریاست حیدر آباد دکن، حصہ اول، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۷۰، ص ۱۳۹
(۲) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتبہ ومترجمہ پروفیسر خلیق انجم، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۰

ہندوستان کے تین زرخیر صوبے بنگال، بہار، اور اڑیسہ مغل سلطنت سے الگ ہو گئے۔ روہیل کھنڈ کے علاقے میں روہیلے طاقت بڑھا رہے تھے مغربی ساحل کا سارا علاقہ گجرات سے مالوہ اور بالا گھاٹ تک مرہٹوں کی تاخت و تاراج کی زد میں تھا۔ اکبرآباد اور دہلی کے درمیان جاٹوں کی شورش کا سلسلہ جاری تھا۔ پنجاب کا علاقہ درانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

> شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات میں لکھا ہے کہ ''نادر شاہ کے حملہ (۱۷۳۹) نے مغلیہ سلطنت کا سارا ڈھانچہ بے جان کر دیا تھا، مرکز سے علیحدہ صوبوں میں خود مختاریاں قائم ہو گئی تھیں سعادت علی خاں نے اودھ میں علی وردی خاں نے بنگال میں نظام الملک نے دکن میں آزاد حکومتوں کی بنیاد ڈال دی تھی پنجاب میں سکھوں کا اقتدار بڑھنے لگا تھا، مغربی اور جنوبی علاقوں میں مرہٹوں نے تسلط قائم کر لیا تھا اور بہار، اڑیسہ اور بنگال کو تاخت و تاراج کر رہے تھے، دہلی میں ایرانی، تورانی نزاع پورے عروج پر تھا۔ امراء آپس کے عناد اور دوسرے فریق کو شکست دینے کی خاطر مرہٹوں سے امداد لیتے تھے'' (۱)

محمد عمر کا کہنا ہے کہ ''سیاسی اعتبار سے یہ حملہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت خطرناک اور نقصان رساں ثابت ہوا اس نے مغلیہ بادشاہوں کے ظاہری وقار کو بڑا دھکا پہنچایا اور ان کی کمزوری کو ظاہر کر دیا۔ اس کی وجہ سے ملک کی باغی طاقتوں کو ابھرنے کا سنہری موقع ملا'' (۲)

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کا صدیوں سے بنا ہوا وقار شان و شوکت اس حملے کے ساتھ ہی مٹی میں مل گیا۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے بالکل پست ہو گیا۔ اسی طرح خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ ''مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بے جان ہو کر گرنے لگا۔ صوبائی گورنروں جاگیرداروں، امراء اور حکام نے سیاسی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت بڑھانی شروع کی

---

(۱) شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۴۲ تا ۴۳

(۲) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۸ تا ۲۹

اور وہ سلطنت مغلیہ جس کا اقتدار کبھی کشمیر سے دکن اور بنگال سے کابل وقندھار تک تسلیم کیا جاتا تھا سمٹ کر قلعہ معلیٰ کی چار دیوری میں آ گئی''(١)

احمد شاہ ابدالی کے حملے: اور دلی کی تباہ و بربادی:

نادر شاہ کے حملے کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغل سلطنت کے رہے سہے وقار کو اور بھی گرا دیا۔ اس نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر نو حملے کئے اس کے حملوں کی وجہ سے نہ صرف مغل بادشاہوں کی حالت ابتر ناک ہوگئی بلکہ عوام کی حالت پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا معاشرہ کا ہر ایک طبقہ متاثر ہوا۔ قائم چاند پوری نے اس صورتِ حال کو اس طرح واضح کیا ہے۔

شہر داخل ہوا جب ابدالی
دیکھ درانیوں کے چہرہ رفت
ایک شش و پنج میں تھی خلق خدا
کہ کہیں ہو نہ اوس سے ہشت و ہفت
نہ فقیروں کی چھوڑتے تھے کلاہ
نہ امیروں کا جامئہ زر بفت

شاہ از تخت گاہ دہلی رفت

جس وقت احمد شاہ ابدالی نے حملے کئے اس وقت کے سیاسی حالات بے حد پیچیدہ تھے۔ حالانکہ بادشاہ کو بہت پہلے ہی اس کی اطلاع مل چکی تھی لیکن وہ اور اس کے امراء ووزرا عیش وعشرت میں محو تھے۔ ان میں اتنی اہلیت نہ تھی کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکتے۔

احمد شاہ ابدالی نے پہلا حملہ ۱۷۴۷ء میں پنجاب پر کیا اس نے لاہور اور سرہند پر بنا کسی مقابلے کے تسلط کر لیا۔ لیکن منوپور کے مقام پر مغل فوجوں نے ان کو شکست دی۔ اس

---

(١) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۳۱۱

طرح ابدالی کا پہلا حملہ تقریباً ناکام رہا۔ اسی دوران ۱۴/ مارچ ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کا مرض استقا میں انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد آصف جاہ نظام الملک بھی جو احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر سن کر دہلی کی طرف آ رہا تھا۔ راستہ میں فوت ہو گیا۔ صفدر جنگ نے شہزادہ احمد کو مجاہدین ابوالنصر احمد شاہ بہادر کے لقب سے پانی پت کے قریب تخت پر بٹھایا۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ صفدر جنگ کی وزارت کے زمانے میں اندرونی خلفشار تیزی سے بڑھنے لگا۔

۱۷۵۰ء میں احمد شاہ ابدالی نے دوسری بار پنجاب پر حملہ کیا صفدر جنگ نے مغل بادشاہ کے اصرار پر ابدالی کے خلاف مرہٹوں سے معاہدہ کیا۔ لیکن یہ معاہدہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا معین الملک (۱) نے جو لاہور کا وائسرائے تھا، ابدالی سے صلح کر لی اور پنجاب کا کچھ علاقہ احمد شاہ کو دے دیا۔

ابدالی نے تیسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں کیا۔ اس حملے کی خبر سن کر معین الملک نے ۹ لاکھ روپے ابدالی کے پاس بھیجے تاکہ یہ روپیہ لے کر وہ واپس چلا جائے لیکن اس نے پیش قدمی کو جاری رکھا۔ معین الملک، ابدالی سے جنگ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لاہور کے ایک بااثر تاجر کورامل نے ابدالی سے صلح کرنے کی سخت مخالفت کی۔ بالآخر معین الملک اور ابدالی کے درمیان جنگ ہوئی۔ جس میں معین الملک کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ''معین الملک نے جان بخشی کے عوض دس لاکھ روپیہ دینا منظور کیا مزید براں اس علاقے کے بدلے میں دس لاکھ روپے کی ادائیگی طے ہوئی جو اس کے حوالے کیا گیا تھا، اس کے علاوہ ہندوستان سے واپس چلے جانے کے صلے میں دس لاکھ روپیہ اور دیا گیا شاہ ابدالی نے ملتان اور لاہور کے صوبے اپنے علاقے میں شامل کر لئے'' (۲)

ابدالی نے ہندوستان پر چوتھی بار حملہ ۱۷۵۲ء میں کیا۔ اس حملے کی اہم وجہ یہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی نے کشمیر کے گورنر سے اس کی اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا لیکن گورنر کے انکار کرنے پر ابدالی نے حملہ کر دیا۔ جس میں احمد شاہ ابدالی کو کامیابی ملی اور کشمیر اس کے قبضے میں آ گیا۔

---

(۱) قمر الدین خاں کا بیٹا تھا

(۲) محمد عمر اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۳۸ بحوالہ خزانہ عامرہ، ص ۹۸ تا ۹۹

اس دور میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور غارتگری کی وجہ سے دلی کئی بار اجڑی۔ معاشی بدحالی اور افراتفری ایسی پھیلی کہ اس عہد کا ہر شاعر متاثر ہوا سودا نے اس عہد کی صورت حال کا ذکر اس طرح کیا ہے:

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز

نہیں وہ گھر نہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام مسجد میں جائے بہر نماز

تو واں چراغ نہیں ہے، بجز چراغ غول (۱)

احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ ۱۷۵۷ء میں عالمگیر ثانی کے عہد میں ہوا۔ اس حملے کی وجہ سے دلی میں پہلے سے بھی زیادہ تباہ و بربادی پھیلی۔ سیاسی حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ تاریخی ماخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر ثانی نے خود غازی الدین سے نجات پانے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو اس حملے کے لئے آمادہ کیا تھا احمد شاہ ابدالی نے غازی الدین کو معطل کر کے عالمگیر ثانی کے بڑے بیٹے عالی گوہر کو نائب سلطنت مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے سپاہیوں نے دلی میں جو تباہی و بربادی پھیلائی تھی اس کا ذکر میر تقی میر نے اس طرح کیا ہے۔

''شام کے بعد منادی ہوئی کہ بادشاہ نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہئے کہ پریشان نہ ہو'' مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے ظلم وستم ڈھانا شروع کئے، شہر کو آگ لگا دی، گھروں کو جلا دیا اور (ساز و سامان) لے گئے صبح کو جو (گویا) صبح قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کر لیا۔ بہتوں کو جلا دیا اور سر

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء، ص ۳۷۰

کاٹ لئے۔ ایک عالم پر یہ مظالم توڑے اور تین دن رات تک اس ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھا دیں (ان مصیبتوں سے کتنوں ہی کے) سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کر دیئے وہ فتنہ گر ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ اور شرفاء کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔ شہر کے عمائد خستہ حال ہو گئے۔ بڑے بڑے امیر ایک گھونٹ پانی کے لئے بھی محتاج بن گئے۔ گوشہ نشیں بے گھر اور نواب گداگر بن گئے شرفاء ننگے تھے۔ گھر والے نگھرے، ہر ایک بلا میں گرفتار اور سوائے کوچہ و بازار تھا، اکثر لوگ مصیبت میں مبتلا، اور ان کے زن و فرزند اسیر، شہر میں (غارت گروں کا) ہجوم تھا۔ اور بے روک ٹوک قتل و غارت ہو رہی تھی لوگوں کا حال ابتر ہو گیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آ گئی (یہ غارت گر) زخم بھی لگاتے اور گالیاں گفتار یا بھی دیتے، روپیہ بھی سب چھین لیتے اور مار الگ لگاتے، جو سامنے آ جاتا اس کے بدن کے کپڑوں تک نہ چھوڑتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مر گیا۔ ایک جہاں کی عزت و ناموس برباد ہو گئی۔ نیا شہر جل کر سیاہ ہو گیا، تیسرے دن انتظام سنبھالا، انزلا خان تیجی آیا تو رہا سہا اس نے لوٹ لیا۔ بارے منتظمین نے لوٹ مچانے والوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں، اب وہ بے رحم لوگ پرانے شہر کو تاراج کرنے میں لگ گئے۔ وہاں بے شمار انسانوں کو قتل کر دیا۔ سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا، ایک وقت کھانے اور سر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں رہے مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی، چونکہ راستے بند تھے، بہت لوگ زخم کھا کھا کر مر گئے۔ کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور شہریوں کو بے آبرو کیا۔ نلہ زبردستی

چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے ان غارت گروں کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہونچ رہا تھا مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا۔ استغراق کے باعث سنتا ہی نہ تھا، ہزاروں خراب اس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترک وطن کر گئے، اور جنگل کی طرف منہ اٹھا کر چل دیئے، چونکہ ان جفا کاروں کی بن آئی تھی، لوٹتے کھسوٹتے، ایزئیں ڈھاتے، ستم، ڈھاتے، عورتوں کی بے حرمتی کرتے، اپنی تلواریں لئے مال بٹورتے پھرتے۔ شہریوں سے کچھ نہ ہو سکتا تھا، کیوں کہ ان میں قوت مدافعت نہ تھی، کوئی سراسیمہ و مضطرب تھا، کوئی حسرت وافسوس کرتا تھا، ہر گھر میں، ہر گلی کوچے میں، ہر بازار میں غارت گر تھے اور ان کی داروگیر، ہر طرف خوں ریزی ہر سمت ظلم وستم ایذا بھی دیتے اور طمانچے بھی مارتے، غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے اور یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھرتے تھے، گھر جل گئے۔ محلے ویران ہو گئے سینکڑوں لوگ ان سختیوں کی تاب نہ لاکر چل بسے، اور کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا، ایک عالم ان کے ستم سے ہلاک ہو گیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر علاقہ جسے رونق و شادابی کے باعث "جہاں تازا" کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے، ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی، یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، خاک سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مر گیا گویا آرام پا گیا۔ اور جو ان کی زد میں آ گیا بچ نہ جا سکا، میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا۔ اب اور زیادہ مفلس ہو گیا۔ افلاس اور تہی دستی سے حال بہت ابتر ہو گیا، سڑک کے کنارے جو مکان تھا وہ ڈھ کر برباد ہو گیا، غرض

کہ وہ ظالم سارے شہر کا اسباب لاد کر لے گئے، اور شہر کے لوگ بڑی
ذلت ورسوائی اٹھا کر جان سے گزر گئے (۱)

جعفر علی حسرتؔ نے مخمس دراحوال شاہ جہاں آباد' میں ابدالی کے حملوں کے باعث دلی میں
جو بربادی پھیلی تھی اس کا تذکرہ کیا ہے مندرجہ ذیل چند اشعار میں اس پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔

نہیں ہے مرثیہ سے کم جہاں آباد کا حال
اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال

وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال
اگرچہ چرخِ ستمگر یہ اس پہ لایا زوال

پر آپ روے ہے رکھ منہ ابر سے رومال
کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں

کہ جیسے بادِ خزان سے ہو حالتِ بستاں
نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں

گذر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہوگیا یہ کشتِ سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب حسیں گل سے
اور ان کی زلفیں فزوں تر تھیں جعد سنبل سے

چمن کے رشک تھے رخسار و خط و کاکل سے
دراز اس پہ ہو دستِ ستم تطاول سے

دریغ مٹ گیا نقشا رہا نہ وہ خط و خال
سواد اس کی سے تھی زلف مہوشاں زنجیر

(۱) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، ص ۱۲۱ تا ۱۲۴

بہار اُس کی سے غرقاب شرم تھا کشمیر
ہر ایک اس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر
جدھر نظر کرو سوجھے تھا عالم تصویر
نہ سر کے واں سے جدھر جا پڑے نگاہ خیال
سواب نہ نہر نظر آوے ہے نہ اس میں آب
کنارے جمنا کے ہے سنگ قلعہ اور سیراب
ہوا ہے اس جگہ مزبل جہاں تھا عطر و گلاب
پڑے ہیں سنگ کے ٹوٹے ستون اور محراب
جو ترشے سرو کی صورت تھے اور شکل ہلال
جہاں کی جان تھا یہ شہر جسم تھا عالم
دیا اسی ہی کو عالم کا اس فلک نے غم
اب اس کے غم کی خرابی سے آہ مرتے ہیں ہم
کدھر گئے وہ رفیق اور کدھر گئے ہمدم
کہ دور ہوتا تھا دیکھے سے جن کے رنج و ملال (۱)

جعفر علی حسرت کی طرح سودا، میر تقی میر، مصحفی نے بھی دلی کی تباہ حالت کا تذکرہ کیا ہے:

سودا کے مطابق دلی کی حالت:۔

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اوداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں پڑے مرغول (۲)

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء، ص ۵۴ تا ۵۵
(۲) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص ۳۷۰

مصحفی کے مطابق:

میاں مصحفی کیا خاک لگے دلی میں اب دل
یہ بستی گئی کچھ اجڑ ایسی کہ نہ پوچھو

ہندوستان نمونۂ دشت بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

کہ جیسے فوج شاہ آکر جہاں آباد لوٹے ہے
وقار ہند میں کمتر ہے اب سپاہی کا(۱)

میر تقی میر کے مطابق:

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و درگرے ہیں، ویراں پڑے ہیں گھر سب(۲)

اس طرح روز روز کی تباہی و بربادی کا یہ اثر ہوا کہ تمام ملک میں خاص طور سے دلی میں افلاس، بے چینی و پریشان حالی اور بدامنی کا دوردورہ ہوگیا۔ ہر شخص سراسیمہ اور حواس باختہ نظر آنے لگا۔ اس طرح دلی کا یہ عالم تھا کہ نادر شاہ کے حملے کے دوران اس کا انگ انگ ٹوٹ چکا تھا لٹی پٹی دلی جسے حملہ آوروں (احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران) اور بھی جی بھر کے لوٹا تھا۔ دلی کے اطراف میں غنڈوں کا راج تھا، راتوں کو ڈاکے پڑتے تھے۔ اس طرح ہر ایک جان و مال بچانے کی خاطر دلی سے ہجرت کر رہا تھا۔ بس لال قلعہ کے آس پاس فوجیوں کے ڈر سے کچھ امن و امان قائم تھا۔ سلطنت تو اس وقت برائے نام رہ گئی تھی۔ ہندوستان کی جو دولت و عظمت تھی وہ سب غیر ملکی حملہ آوروں نے لوٹ لی تھی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ مصحفی نے مندرجہ ذیل اشعار میں اس عہد کے حالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اطراف میں دلی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور
جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ وہاں ہے

---

(۱) غلام ہمدانی مصحفی، دیوان مصحفی، مرتبہ منتخب اسیر لکھنوی و امیر مینائی، پٹنہ،۱۹۹۰، ص۳۵

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۶۱، ص۵۴۷

اور پڑتے ہیں راتوں کو جونت شہر میں ڈاکے
باشندہ جو واں کا ہے بہ فریادوفغاں ہے

بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے وھاں کا
ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

دو چار تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں ان سے
بس قلعہ کے نیچے ہی تک اک امن و اماں ہے

جزدیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں
ناسور ہے سینے کا اگر آب رواں ہے

آتا ہے نظر چوں دل عشاق شکستہ
اس شہرمیں جو قصر فلاں ابن فلاں ہے

خون ریزی ہی اس خاک پہ رہتی ہے ہمیشہ
اب سنگ بھی واں ہے تو یہی سنگ فساں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جاکر کوئی پوچھے
جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے

ملتا ہے بصدر رنج انہیں رزق کم و بیش
اور چاہیں فراغت، سورفراغت تو کہاں ہے

بیٹھے تھے جہاں کج کلہساں لگا کر
وہاں اب جو نظر کیجیے تو تکیہ کا مکان ہے

بت خانہ و مسجد میں جو پھیلی ہے خرابی
ناقوس کا نالہ نہ موذن کی اذاں ہے
زیں دوز کی صورت نظر آتی نہیں مطلق
اور ہے بھی تو جوں سوزن گم گشتہ کہاں ہے
زر دار سا دیکھے ہے جسے راہ میں جاتے
طرار بھی پیچھے ہی سے جوں سایہ رواں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دلی میں خزاں ہے (۱)

اس طرح معاشرے میں کسی بھی طبقے کو اطمینان نہیں تھا۔ سیاسی حالات کے ابتر ہو جانے سے پورے ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ جیسا کہ مصحفی نے مندرجہ ذیل بالا اشعار میں واضح کیا ہے مرہٹہ گردی نے حالات کو اور بھی ابتر ناک بنا دیا جو تھوڑا بہت امن و امان تھا وہ بھی بالکل ختم ہو گیا۔ میر تقی میرؔ نے مرہٹوں کے ایک حملے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''ابھی ساری بلائیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چرخِ فتنہ انگریز نے ایک نیا ہنگامہ برپا کر دیا عجب افراتفری پھیل گئی یعنی جنکو نامی سردار بھاری فوج لے کر دکن سے آیا اور اس کا لشکر دہلی کے اطراف میں خیمہ زن ہوا۔ بہتوں کے دل دہل گئے ایک ہلڑ مچ گیا۔ امیروں کی سٹی گم ہوگئی بادشاہ وزیر نے اس سے صلح کر لی۔ دتا نامی سردار کو اس بہادر اور جیالے جوان (جنکو) کا مدارالمہام تھا۔ نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا جو جمنا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے تھا گھمسان کی جنگ ہوئی'' (۲)

---

(۱) غلام ہمدانی مصحفی، دیوان مصحفی، ص ۳۵ تا ۳۶
(۲) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، ص ۱۱۸ تا ۱۱۹

اس عہد میں مرہٹوں کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مغل بادشاہوں کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ شاکر ناجی نے مرہٹوں کی شورش کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ بادشاہ کی حیثیت ایک مہرے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔

ملک دکن بیچ دی دلی کے سب شیروں کو شکست
مرہٹا اب ہند میں پھیلا ہے اس مہرے کی خیر (۱)

لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ:

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ میں لکھا ہے کہ ''نویں ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ میں لال قلعہ بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) کے قبضے میں چلا گیا اور شاہی حرم سرا کے ساتھ سلطنت کے تمام کارخانے مرہٹوں کے تصرف میں آ گئے یہ عزیز علم کا نوشتہ تھا'' (۲) اسی عہد میں ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ کو عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم ثانی تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی حیثیت عجیب وغریب قسم کی تھی وہ خود مشرقی صوبہ جات میں قسمت آزمائی کر رہا تھا تو دوسری طرف مرکز میں بے انتہا اختلال واضطراب تھا۔ وہاں مختلف طاقتوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ اس عہد میں مغل سلطنت بالکل محدود ہو گئی تھی۔ شمال مغرب کے صوبے ابدالی کے بیٹے کے پاس تھے۔ پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا۔ دکن میں آصف جاہ کا بیٹا قابض تھا اودھ میں نواب آصف الدولہ تھے جن کا علاقہ اٹاوہ اور سنبھل تک پھیلا ہوا تھا۔ اجمیر راجپوتوں کے پاس تھا اور آگرہ میں نجف خاں قابض تھا۔

اس طرح جہاں اورنگزیب کے عہد میں ۲۲ صوبے شاہان مغلیہ کے ماتحت تھے۔ وہیں اس عہد میں کئی صوبے آزاد ہو چکے تھے۔

سودا نے ان حالات کو اس طرح نمایاں کیا ہے:۔

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند

---

(۱) محمد شاکر ناجی، دیوان شاکر ناجی، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۱

(۲) علامہ مناظر احسن گیلانی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، لائل پور (پاکستان) ۱۹۶۵ء، ص ۷۰

رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول (۱)

'کول' موجودہ علی گڑھ کا نام تھا شاہ عالم کا حکم وہاں بھی نہیں چل پاتا تھا۔

اس عہد میں مرہٹوں کی طاقت دن بدن بڑھتی جارہی تھی وہ دہلی پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے" ہندوستان کی تاریخ کا یہ نازک دور تھا۔ شاہان مغلیہ ان حالات میں بالکل بے بس تھے۔ امراء آپس میں جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے، شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آ کر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے'' (۲) نتیجہ کے طور پر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی۔

پانی پت کی تیسری جنگ ۱۷۶۱ء: اور دلی کی تباہ و بربادی:

اس لڑائی نے برصغیر کی تاریخ کا رخ ہی موڑ دیا۔ دراصل ابدالی کا یہ چھٹا حملہ تھا۔ خلیق احمد نظامی کے مطابق'' اس کا چھٹا حملہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل دیا اور مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کر دیا'' (۳) اسی طرح محمد عمر کا کہنا ہے'' ہندوستان کی تاریخ میں ابدالی کا یہ حملہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس حملے کے موقع پر جنگِ پانی پت ہوئی۔ جس نے مرہٹوں کی روز افزوں طاقت کا قلع قمع کر دیا تھا'' (۴) جس مغلیہ سلطنت کو بچانے کے لئے یہ کوشش کی جارہی تھیں اس حکومت کا دعویدار شاہ عالم ثانی نہ تو کسی مشورے میں شریک تھا اور نہ ہی اس کو ان واقعات میں عملی حصہ لینے کا موقع ملا۔

اس جنگ کی اصل وجہ یہ تھی کہ مرہٹے اور احمد شاہ ابدالی دونوں ہی شمالی ہندوستان میں اپنا اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے چوتھے حملے (۱۷۵۶ء) کے دوران دلی پر تسلط جما لیا تھا اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو دلی کا انتظام سلطنت چلانے کے لئے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب (۵) کا صوبے دار مقرر کیا۔ ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے اپنے سردار

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، ص ۳۶۷

(۲) شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۹، ص ۴۳

(۳) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۲۷

(۴) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۵۷

(۵) پنجاب پر ابدالی نے ۱۷۵۲ء میں قبضہ کیا تھا

رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں دلی پر قبضہ کرلیا۔ اور اگلے سال یعنی ۱۷۵۸ء میں انہوں نے تیمور شاہ کوشکست دے کر پنجاب پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح مرہٹوں کی یہ دونوں فتوحات احمد شاہ ابدالی کی طاقت کے لئے ایک چیلنج تھی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء میں یہ جنگ ہوئی۔

جہاں پانی پت کی پہلی جنگ (۱۵۲۶ء) میں بابر نے اپنی فتح کے بعد مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی تو وہیں دوسری طرف تیسری جنگ نے مغل سلطنت کو نیست و نابود کر دیا۔ حالانکہ یہ جنگ مرہٹوں اور ابدالی کے درمیان ہوئی تھی جس میں مرہٹوں کی بری طرح شکست ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس جنگ کا اثر مغل سلطنت پر بھی پڑا مغل سلطنت پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہوگئی ''اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کرسکتی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کی مانند تھی جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا''(۱)

اس جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے کشمیر، پنجاب اور سندھ کے صوبوں کو اپنی سلطنت میں ملالیا۔ اور تخت دہلی پر شاہ عالم کا حق تسلیم کیا۔

جنگ کے بعد دلی کی تباہ و بربادی: میر تقی میر کی زبانی:

میر تقی میر نے پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد دہلی کی ویرانی اور تباہی کی جو کیفیت دیکھی۔ اس کا حال ''ذکرِ میر'' میں ان الفاظوں میں بیان کیا ہے۔

''میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گذرا ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا جوں جوں آگے بڑھا حیرت بڑھتی گئی مکانوں کی شناخت نہ کرسکا نہ آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے آثار نہ ان کے مکینوں کی خبر ملی!

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جا نیست
از ہر کہ نشاں جسم، گفتند کہ پیدا نیست

---

(۱) شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۴۵

گھر کے گھر مسمار (تھے اور) دیواریں شکستہ، خانقاہیں صوفیوں سے خالی خرابات رندوں سے یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق ودق

ہر کجا افتادہ بدم حشت درویرانہ
بود فردِ احوالِ صاحبِ خانہ

نہ وہ بازار (تھے) جن کا ذکر کروں، نہ بازار کے حسین لڑکے (اب) حسن کہاں جسے تلاش کروں؟ وہ یاران عاشق مزاج کدھر گئے؟ حسین جوان گزر گئے، پیران پارسا چلے گئے (بڑے بڑے) محل خراب (ہوگئے) گلیاں ناپید (ہوگئیں اور ہر طرف) وحشت برس رہی تھی، اُنس ناپید (تھا)....ناگاہ اس محلہ میں پہنچا جہاں میرا گھر تھا....دن رات صحبتیں گرم رہتی تھیں شعر پڑھتا تھا۔ ورعاشقانہ بسر کرتا تھا، راتوں کو روتا تھا، اور حسینوں سے عشق کرتا تھا، وہاں کوئی شناسا تک نہ ملا کہ دوگھڑی باتیں کروں، کھڑا حیرت سے تکتا رہا۔ سخت صدمہ ہوا اور عہد کیا کہ اب پھر نہ آؤں۔

ان حالات کی مکمل عکاسی میر تقی میر، سودا، حسرت اور قائم کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

میر کے مطابق۔

اب خرابا ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یھاں گھر تھا(۱)

اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا ہیکویاں خرابا(۲)

اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں
سونالیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم(۳)

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص۴۲
(۲) ایضا............ص۲۵
(۳) ایضا..........ص۲۸۹

یا رب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے
او جڑ دکھائی دے ہیں شہر وہ نگر سب(۱)

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یہاں سے پھر کھوج نہ پایا(۲)

سوداؔ کے مطابق: ؎

کسی کے یاں نہ رہا آسیا سے تابہ اجاغ
ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ

جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول
جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا

مگر کبھو عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا

عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول(۳)

جعفر علی حسرت نے مندرجہ ذیل اشعار میں دلی کی کیفیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے: ؎

رہے نہ آئینہ خانے نہ دیکھنے والے
پڑے ہیں آبلے سینوں میں، پاؤں میں چھالے

---

(۱) کلیات میر ص ۵۴۷
(۲) ایضاً ص ۴۲
(۳) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء، ص ۳۷۰ تا ۳۷۱

نہیں وہ مست وہ شیشے وہ جام وہ پیالے
جو دل تھے شیشہ عفت توڑ چرخ نے ڈالے
پڑے ہیں خاک میں نکلیں جو کیجیے غربال(۱)

شاکر ناجی کے مطابق:

فلک نے چن چن کے اے ناجیؔ نہ چھوڑے
کہاں اب جگ منیں قابل رہا (۲)

اس طرح دلی کی عوام کو ان بیرونی حملہ آوروں کے باعث مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن بادشاہِ وقت (شاہ عالم ثانی) کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سات سال تک (۱۷۶۴ تا ۱۷۷۱ء) شاہ عالم دلّی سے غیر حاضر رہا وہ اس دوران الہ آباد میں تھا (۳)۔ ۱۷۷۱ میں مرہٹوں کی مدد سے جب وہ دلی واپس آیا تو مرہٹوں نے اس کو ضابطہ خاں (۴) کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کیا۔ مرہٹوں کے دل میں اس کی طرف سے اس لیے عناد تھا کہ اس کے والد نجیب الدولہ کی وجہ سے کئی سال تک طرح طرح کی اذیتیں اٹھاتے رہے تھے خصوصاً سندھیا اس سے اس لیے نالاں تھا کہ میدان پانی پت میں نجیب الدولہ کی وجہ سے اس نے ایسا زخم کھایا تھا جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا اس طرح نجیب الدولہ نے مرہٹوں کے عزائم کو اور ان کے مرہٹہ راج کے خواب کو پورا ہونے نہیں دیا تھا۔

آخر کار شاہ عالم ثانی کو اپنی مرضی کے خلاف مرہٹوں کے ساتھ ضابطہ خاں کے خلاف مہم پر جانا پڑا۔ بادشاہ اور مرہٹہ افواج کی اطلاع ملتے ہی ضابطہ خاں اپنے صدر مقام

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھنؤ ۱۹۶۶ء، ص ۵۵
(۲) محمد شاکر ناجی، دیوان شاکر ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق، ادارہ شعبہ ادب دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۵۳
(۳) شاہ عالم ثانی الہ آباد میں انگریزوں کی نگرانی میں تھا وہ بادشاہ تو تھا لیکن اس کی کوئی راجدھانی نہیں تھی اور نہ ہی حکومت میں اس کا کچھ ہاتھ تھا۔ ۱۷۷۱ میں شاہ عالم ثانی دلی کے قلعہ میں پہنچ تو گیا لیکن اس وقت اس کے قبضے میں وہ بھی نہیں تھا۔
(۴) نجیب الدولہ کا بیٹا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۷۷۰ء میں اس کی جگہ دربار میں منصب دار مقرر ہوا۔

غوث گڑھ(۱) کو چھوڑ کر دریائے گنگا کے کنارے سکھرتال کے مقام پر پہنچ گیا۔ اسی مقام پر بادشاہ معہ مرہٹہ افواج نے ۱۷۷۲ میں ضابطہ خاں کو بری طرح شکست دی۔ کبیر نے مندرجہ ذیل اشعار میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

ضابطہ خاں کو دی وہ حشمت و جاہ
وہیں کر ڈالا لے کے خوار و تباہ

چھوڑ سارے رفیق بھاگ گئے
اپنے اپنے ٹک ٹھکانے لاگ گئے

باقی جو غوث گڑھ میں ٹھہرے ہیں
ان پہ ضبطی اور پہرے ہیں (۲)

اس واقعہ کے بارے میں قائم چاند پوری کا کہنا ہے:

ماری ہے جیسے ضابطہ خاں کے اوپر سپاہ
آسوج کی تکے ہیں مرہٹے اودھر سے راہ

بستی کے لوٹنے پہ، رہیلوں کی ہے نگاہ
ایک خلق ہے اسیر، عجب مخمصے میں آہ

رہنے کا ہے مقام، نہ جانے کو راہ ہے(۳)

میر تقی میر بھی اس مہم میں شریک تھے۔ انھوں نے اس واقعہ کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

اسی زمانے میں سندھیا جو دکھنی سرداروں میں سے ایک بڑا سردار ہے، پیشوائی کے لیے جا کر بادشاہ کو اپنے ساتھ لایا اور شہر میں داخل ہوا۔

---

(۱) اس وقت غوث گڑھ ضلع سہارنپور میں تھا

(۲) کبیر کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۸۸

(۳) قائم کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۸۶

اس (بات) کو ابھی کچھ (دن بھی) نہ گذرے تھے کہ (مرہٹہ) سرداروں نے باہم طے کیا کہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر نجیب الدولہ مرحوم کے لڑکے ضبطہ خاں پر چڑھائی کرنی چاہیے۔ بادشاہ ہر چند بیماری کا بہانہ کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس تقریب سے میں بھی شاہی لشکر کے ہمراہ اس طرف روانہ ہوا۔ ان لوگوں نے (وہاں) جا کر (نواب) ضابطہ خاں کو بغیر جنگ کے ہی بھگا دیا۔ اس کے اموال اور گھر بار اور زن و فرزند پر قبضہ کرلیا۔ بادشاہ کو بجز دو سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پرانے خیموں کے کچھ بھی نہ دیا۔ بادشاہ (مرہٹوں کی) اس حرکت سے بہت ہی بددل ہوا، مگر کر کیا سکتا تھا۔ مرہٹے (اپنی طاقت کے) گھمنڈ میں تھے اور یہاں نہ زور تھا نہ زر۔ جب انھیں روپیہ نہیں ملا تو شاہی کارندوں نے یہاں کے شرفاء کی جاگیریں دھڑا دھڑ ضبط کرنا شروع کردیں'' (۱)

میر تقی میر کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شاہ عالم بے بس تھا مسلمانوں کی تباہی و بربادی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ قائم چاند پوری نے (جو اس وقت ٹانڈہ (روہیل کھنڈ) میں مقیم تھے)، شاہ عالم کے اس فعل سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے شاہ عالم کے خلاف اپنے تاثرات مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح بیان کیے تھے:

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
لُچا ایک آپ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے
ناموسِ خلق، سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے، نہ ظلِ الٰہ ہے

---

(۱) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی مترجمہ نثار احمد فاروقی، دہلی ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۵ تا ۱۷۶

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو
ہووے گا بادشاہ بھی، پھر ہند میں کبھو
تازمزمہ وہی ہوں، سر نووئ غلو
سو آسماں نے لاکے، مسلط کیا تو تو
جس کے ستم سے چار طرف، آہ آہ ہے

لشکر میں مرہٹہ کے جو کوئی رہے (ہیں) بند
دیکھے ہیں ان کے ظلم کے، سب پست اور بلند
اب نام فوج سن کے وہ، بھاگے ہیں جوں پرند
سچ ہے کہ جس کو سانپ سے، پہنچے کبھو گزند
رسی کو جانتا ہے کہ، مار سیاہ ہے

سمجھا تو اس قدر بھی اے بھڑوے خبیث خر
کس پر ہوا یہ مظلمہ، لوٹا کنھوں نے زر
پر نیک و بد میں آدمی کرتا ہے یہاں نظر
تُو خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر
جس کا خطاب حماقت پناہ ہے

دادا (۱) تیرا جو لعل کنور کا تھا مبتلا
کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلہ
دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھاپن ان کا ترا عذر خواہ ہے

---

(۱) جہاندار شاہ

اے ماچہ خر، تو خر سے بتر بلکہ خر کا ننگ
پیدا تری جبیں سے ساروں گدھوں کے ڈھنگ
شومی کو تری دیکھ کے اُلو ہوئے ہیں دنگ
کیا جانے یہ کہ کھائی ہے تیں، کس طرح کی بنگ
احمق تو اور بھی ہیں، پہ تُو تو بادشاہ ہے(۱)

سکھرتال کی لڑائی کا وقتی طور پر یہ اثر ہوا کہ مرہٹوں نے شاہ عالم کو شاہ شطرنج بنا کر ضابطہ خاں کے بہت سے علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح مرہٹے مغلیہ سلطنت کے امورِ ملکی میں پوری طرح قابض ہو گئے۔

غلام قادر روہیلہ کا عروج اور شاہ عالم کا دردناک انجام:

غلام قادر روہیلہ جو کہ ضابطہ خاں کا بیٹا تھا وہ سکھرتال کے معرکے میں اپنے والد کی شکست اور اس کے بعد اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کا ذمے دار شاہ عالم ثانی کو مانتا تھا۔ اس وقت غلام قادر تقریباً دس سال کا تھا جب ضابطہ خاں اپنی طبعی موت سے مر گیا تو وہ اپنے والد کی موت کا ذمہ دار بھی شاہ عالم کو ہی مانتا تھا۔ جیسا کہ اظفری نے لکھا ہے ''کھلم کھلا کہنے لگا کہ بہت جلد شاہجہاں آباد پہنچتا ہوں اور اپنا بدلہ لیتا ہوں اور اس قلعے کو جمنا میں غرق کر دوں گا'' (۲)

آخر کار ۱۷۸۸ء میں اس کو موقع مل گیا۔ اس نے بادشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لیں اور نہ صرف اسی کو بصارت سے محروم کر دیا بلکہ شہزادیوں اور بیگمات کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔

> اظفری کا کہنا ہے کہ ''حقیقت تو یہ ہے کہ اس عالیشان خاندان پر وہ بلائیں پڑیں جو نہ کہنے کے قابل نہ سننے کے، دہلی کی آنکھوں نے انھیں دیکھ لیا، جو کچھ دیکھا وہ ایک بلا تھی۔ اصل عبرت کو آگاہ کرنے والی اور ایک ناگہانی آفت تھی۔ صاحب بصیرت کو متنبہ اور بیدار کرنیوالی یعنی غلام قادر خاں

---

(۱) قائم کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۸۰ تا ۸۲

(۲) محمد ظہیر الدین اظفری، واقعات اظفری، مترجم عبدلستار، مدراس، ۱۹۳۷، ص ۵

یوسف زئی افغان نے سرکشی خودرارنی کا علم بلند کیا اوراس بلند مرتبہ خاندان کے تمام حقوق کو بالکل بھلا کرتہس نہس کر دیا۔ اندھے پن اور بے حیائی کی بنیاد ڈالی۔ قدیم بنی ہوئی مستقل عمارت کو نئے سرے سے ویران کرڈالا اور نہایت بے ادبی و بے پروائی سے میدان دغا میں اتر کر اس صاحب عزت ومرتبت بادشاہ کوایذارسانی اوران بے گناہوں کوضرر پہنچانے پرآمادہ ہوگیا جواس فیض بنیان خاندان سے تعلق یا توسل رکھتے تھے۔ نہایت نامعقول افعال اور کمینہ طریقے سے اپنے کوتاہ ہاتھوں کو چھوٹے بڑوں کے جان و مال پر دراز کیا یہاں تک کہ اس بادشاہ کی آنکھیں حلقۂ چشم سے نکلوادیں اور اسے تخت سلطنت سے الگ کردیا''(۱)۔

محمد عمر نے ''واقعات شاہ عالم'' کے حوالے سے لکھا ہے ''غلام قادر نے بادشاہ کوحرم سرا سے طلب کیا، شاہ عالم بادشاہ اورشہزادیوں کوموتی محل میں گنہ گاروں کی طرح گرم اینٹوں پر کھڑا کروا کراورمرزا اکبراورسلیمان کو بندھوا کرفراشوں کوانھیں پیٹنے کا حکم دیا بیدارتخت نے مشکل کشائی اس کے بعد غلام قادر نے انھیں تیز دھوپ میں بٹھوادیا۔ شاہی مستورات کے ہاتھوں اور پاؤں پر کھولتا ہواروغن ڈالا گیا اورطرح طرح کی سختیاں کر کے ان سے دفینوں کی نشان دہی کرائی گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں بیٹھا ہوا شاہ عالم، غلام قادرکوبُری بُری گالیاں دے رہا تھا اورفریاد وآہ زاری کررہا تھا۔ غلام قادر کے حکم کے مطابق روہیلوں نے اسے زبردستی زمین پر پٹک دیا اوراس کی آنکھیں نکال لیں۔ مستورات کے جسم سے کپڑے اور زیورات اتار کر انھیں دربدر کی ٹھوکری کھانے دریوزہ گری کرنے کے لیے محل سے نکال دیا گیا'' (۲)

اظفری کے علاوہ شاہ عالم پر جومظالم غلام قادر نے کیے تھے اس کا ذکر میرتقی میر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

---

(۱) محمد ظہیرالدین اظفری، واقعات اظفری، مترجم عبدلستار، مدراس، ۱۹۳۷، ص ا

(۲) محمد عمر اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، ص ۱۱۷، بحولہ واقعات شاہ عالم (یا عبرت نامہ)، مولوی خیرالدین، کلمات قاسم، ص ۴۰ نیز ۴۰۱

''بادشاہ کے ناظر نے غلام قادر کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، اسے لکھا کہ تم آ جاؤ یہاں بادشاہ میرا کہنا نہیں مانتا یعنی مرہٹوں کی طرف داری سے باز نہیں آتا۔ یہ دونوں شہر میں گئے بادشاہ خود کچھ طاقت نہیں رکھتا۔ ناظر نمک حرام کے مشورے سے قلعے کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں لے کر بادشاہ کو علیحدہ کر دیا، اسکے ساتھ ناگفتہ بہ سلوک کیا۔ شہزادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے۔ بہت سا زر و مال اس کے ہاتھ آیا، بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور دوسرا بادشاہ بنا دیا۔ جب پوری طرح تسلط حاصل کر لیا تو ناظر کو بھی قید کر دیا اور شہر والوں کو بھی پریشان کرنا شروع کیا۔ جب اس کا غلبہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو کسی بات پر مرزا اسماعیل سے ٹھن گئی (غلام قادر) روہیلہ قلعہ بند ہو گیا۔ رات کے وقت مع فوج و اسباب اور زر و مال نیز شاہزادوں اور ناظر اور اس کے دوسرے متعلقین کو ساتھ لے کر خضری دروازے سے نکل بھاگا۔ شاہدرے کے قریب اپنی فوجوں کو جمع کیا۔ آخر الامر مرہٹہ (مادھوراؤ سندھیا) اس کی بے حیائی دیکھ کر دریا کے پار گیا اور جنگ شروع کر دی، کبھی یہ غالب آتے کبھی یہ ملعون۔ جب ایک مہینے کے قریب گذر گیا تو علی بہادر نامی ایک سردار دکن سے آیا اور روہیلوں سے جنگ کرنے پر تل گیا اور دو تین جھڑپوں کے بعد بڑی بہادری سے اسیر کر لیا اور اس کا مال و اسباب مع شاہزادوں کے اس سے چھین کر اسے قید میں رکھا اور اسی اندھے شاہ عالم کو بادشاہ مقرر کیا۔ قلعے کو جاٹوں کے حوالے کر دیا۔ اب سو روپے روز بادشاہ کو دیتے ہیں اور تمام ملک پر متصرف ہیں۔ اس ملعون غلام قادر کو بڑی ذلت کے ساتھ مار ڈالا۔ اب مرہٹہ (سندھیا) بادشاہ ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے'' (۱)۔

---

(۱) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی ص ۱۹۰ تا ۱۹۱

اس پہلو کی مکمل عکاسی مصحفی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے:

اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم
چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر اک نگراں ہے (۱)

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملکی اور سیاسی امور میں اس قدر اختلال پیدا ہو گیا تھا کہ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکرے ٹکرے ہوگئی۔ اور اس طرح اس کا اثر عام معاشی، معاشرتی اور تمدنی حالات پر بہت بُرا پڑا اور مسلسل و متواتر جنگوں نے ملک کے سیاسی حالات کو اور پیچیدہ بنا دیا اور زندگی کے ہر شعبے پر قنوطیت کا رنگ جم گیا۔

☆☆☆

---

(۱) غلام ہمدانی مصحفی، دیوان مصحفی، ص ۳۵

باب دوم

نظریہ بادشاہت،مغل بادشاہ
اور
اُن کے اُمراء

باب دوم

نظریہ بادشاہت، مغل بادشاہ اور اُن کے امراء

مغل نظریہ بادشاہت:

مغل نظریہ بادشاہت دراصل ترک منگول نظریہ بادشاہت پر مبنی تھا۔ مغل نظریہ بادشاہت کو سمجھنے کیلئے تیموریوں کا نظریہ بادشاہت کو سمجھنا ضروری ہے۔ تیمور نے ایک مستحکم ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر وہ خود منگول روایتوں سے متاثر تھا۔ اس نے ترک ریاست میں حکمراں کے عہدے کو عزت و وقار بخشنے کی ہر ممکن کوشش کی حالانکہ تیمور نے تاعمر، امیر کا لقب اختیار کیا۔ تیمور کی اس روایت کو اس کے جانشینوں نے برقرار نہ رکھا اور 'سلطان'، 'بادشاہ' جیسے القاب اختیار کئے۔ یہ روایت ہمایوں کے عہد تک قائم رہی۔ مگر اکبر نے اپنے بزرگوں سے مختلف رویہ اپناتے ہوئے سیاسی حالات (۱) کے مدِ نظر ایک نیا نظریہ بادشاہت دینے کی ضرورت محسوس کی۔

مغل نظریہ بادشاہت کی بنیاد عموماً اس تصور پر مبنی تھی کہ بادشاہ شریعت سے بالاتر ہستی نہیں لیکن سلطنت کے انتظامی معاملات میں بادشاہ لامحدود طاقتیں رکھتا تھا۔ مغل بادشاہ خود کو ہندوستان میں بنا کسی تفریق کے ساری رعایا کا محافظ سمجھتے تھے۔ اس طرح بادشاہ ایک محور کی مانند تھا جس پر سلطنت کا دارومدار تھا اس کا اعلیٰ کردار اور اس کی اہلیت ہی ملک میں امن و امان قائم کر سکتی تھی۔ ابوالفضل کا کہنا ہے ''خدا کے نزدیک مرتبہ شاہی سے زیادہ بلند اور کوئی مقام نہیں

---

(۱) ازبکوں یا ترکوں کی بغاوت کی وجہ سے اکبر نے امراء کے ایک نئے طبقے کو ریاست میں شامل کیا۔ یہ نئے طبقے ہندوستانی شیخ زادہ، ایرانی اور راجپوتوں پر مشتمل تھے جن کو اکبر نے ترکوں کے مقابلے میں اہمیت دینی شروع کی۔

اور انسانوں کو صراط مستقیم پر چلانا صرف اسی کا کام ہے۔ اس طرح مغل بادشاہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بادشاہت کا جو تحفہ انھیں خدا کی طرف سے ملا ہے۔ وہ ان کی شخصیت کو بلند بنا دیتا ہے اس لئے بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ نیک زندگی گذارے اور سلطنت کی بہتری کے لئے کام کرے۔

اس طرح اس نظریے کے تحت یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہ بحیثیت ایک خدا کے نمائندے کے مانند تھا۔ یعنی بادشاہ کی طاقتیں اس قدر لامحدود تھیں کہ مغل نظریۂ بادشاہت کے مطابق اس کو "ظل الہی" قرار دیا گیا اور اس کو خدا کا نائب کہا جانے لگا۔

> ابن حسن نے ابوالفضل کے حوالے سے لکھا ہے "طوائف الملوکی، انتشار، انسانی خودغرضانہ فطرت اور طاقتور کے ظلم وستم ہی کی وجہ سے بادشاہ کی ضرورت کا جواز پیدا ہوتا ہے اس لئے رعایا کی حفاظت کرنا بادشاہ کا فریضۂ اولین قرار پایا (۱)

اس طرح نظریۂ بادشاہت پر عمل کرتے ہوئے مغل بادشاہ سلطنت کے تمام امور اور انتظامات کی نجی طور پر نگہداشت کرتے تھے اور رعیت کے تمام معاملات میں ذاتی دلچسپی لیکر انھیں حل کرتے تھے۔ اکبر پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے روزمرہ کے معمولات کو سخت اصولوں سے ترتیب دیا۔ اس کے دن رات کا ہر لمحہ کسی نہ کسی ریاست کے کام کے لیے وقف تھا۔

جہانگیر بھی بادشاہت کو عطیۂ خداوندی سمجھتا تھا۔ شاہ جہاں کی نظر میں بادشاہت کا مطلب ان لوگوں کی زندگی کو آرام دہ بنانا تھا جو خدا کی امانت ہیں۔ بادشاہ کو اپنی ساری طاقت کمزوروں کی بہتری اور خدا کے بندوں کی محبت کے لئے صرف کردینی چاہیے۔ اورنگ زیب جب بادشاہ بنا تو اس حقیقت سے واقف تھا کہ ذراسی غلطی کس طرح انقلابی تبدیلیاں لاسکتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے دور حکومت میں اپنی انتہائی بیماری کے باوجود بھی روزمرہ کے

---

(۱) ابن حسن، سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت، مترجم آئی اے ظلی، دہلی ۱۹۸۲، ص ۶۲

معمولات کوتبدیل نہیں کیا۔اوران پر پابندی کے ساتھ عمل کیا۔

اورنگ زیب کا نظریۂ بادشاہت انصاف، رعایا کی نگہبانی اور ظالموں کوسزا دینے پرمبنی تھا۔اورنگ زیب کا ماننا تھا کہ ''بادشاہت کا مطلب حکومت کرنا، رعایا کوظلم وزیادتی سے محفوظ رکھنا اورانکی سرپرستی کرنا ہے

نہ کہ عیش وعشرت میں زندگی گذارنا ہے۔اورنگ زیب کے نظریۂ بادشاہت کے مطابق بادشاہ کواپنی سلطنت کے ایک ایک گوشہ سے باخبر ہونا چاہئے کہ کہاں کیا ہورہا ہے۔اس لئے کہ ایک لمحہ کی لاپروائی کئی سالوں کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔بادشاہ کوآرام پسند نہیں ہونا چاہئے۔اس کو ہمیشہ حکومت کے کاموں اور ملک کے مسائل کوحل کرنے میں مصروف رہنا چاہئے تاکہ مسائل حل ہوتے رہیں اور رعایا آرام سے رہ سکے۔اگرکوئی بادشاہ ان اصولوں پرعمل نہیں کرے گا تو وہ حکمراں زیادہ دن بادشاہت نہیں کرسکتا۔ایسی صورتحال میں حکومت کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔اس طرح جہاں تک اورنگ زیب کے نظریۂ بادشاہت کا سوال ہے تو اس نے اپنے نظریۂ بادشاہت میں اپنے آباواجداد کے نظریات کواہمیت دی مگراپنے تجربات اورتقاضوں کومدنظر رکھتے ہوئے بادشاہت اور بادشاہ کی اہمیت پر زوردیا۔

اٹھارہویں صدی میں مغل بادشاہت:

اورنگ زیب تک تو مغلوں کانظریۂ بادشاہت یہ تھا کہ مغل بادشاہ کسی کے جوابدہ نہیں تھےاوروہ اس پرعمل پیرا بھی تھے۔لیکن اٹھارویں صدی کے نصف میں بادشاہ سیاسی واقتصادی طور پربےحد کمزورہوگئے۔مغل نظریۂ بادشاہت جس پراورنگ زیب تک تو بہ خوبی عمل کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد سے تو مغل بادشاہت صرف ایک نظریہ بن کررہ گیا۔اس وقت سلطنت اور بادشاہ بےمعنی ہوکررہ گئے تھے۔حالانکہ بادشاہت کا اہم ترین اصول یہ تھا کہ ہمیشہ سلطنت کی بہبودی کے لئے گامزن رہنا اورعیش وعشرت کی زندگی کو نہ گذارکر سلطنت میں ہونے والے

ہر ایک پیدا شدہ مسائل کو دھیان میں رکھے۔ اور ان مسائل کو ہر ممکن حل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے برخلاف اٹھارویں صدی کے آغاز میں مغل بادشاہ اپنی ذمے داریوں کے تئیں تغافل وتساہل کا شکار تھے۔

اس عہد کے ہم عصر شعراء جیسے جعفرزٹلی، شاکرناجی، حاتم، محمد رفیع سودا، میر تقی میر، قائم چاند پوری اور دیگر شعراء نے بادشاہوں کے کردار کے ہر پہلو کا تذکرہ کیا ہے۔ جعفرزٹلی نے مندرجہ ذیل اشعار میں اورنگ زیب کے جانشینوں کی برائے نام بادشاہت اوران کی لاپرواہیوں کی وجہ سے عوام کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا تھا اس کا ذکراس طرح کیا ہے:

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل وکامل دل آگاہ

رکت کے آنجھواں جگ روتا ہے
نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

دوادو ہر طرف بھاجڑ پڑی ہے
بچہ درگور، سر گٹھیا سر دھری ہے

اکل بیکل ہوا سنسار سارا
بخوں تیار شد مریخ تارا(۱)

جعفرزٹلی کے مندرجہ بالا اشعار میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد آنے والے حادثات کی عکاسی ملتی ہے ان اشعار سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان باشاہوں کی لاپرواہی سے نظم ونسق میں نقائص پیدا ہوگئے تھے۔ جہاں اورنگ زیب نے اپنی دور اندیشی سے ملک کو روز افزوں ترقی دی تھی۔

---

(۱) میر جعفرزٹلی، کلیات میر جعفرزٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹، ص ۱۶۶

اس طرح جعفر زٹلی نے اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطالعہ سے سلطنت کے زوال کا اندازہ اس وقت کر لیا تھا۔ یہ جعفر زٹلی کی سیاسی اور سماجی فراست کی بہت بڑی اور قابلِ تعریف وشہادت ہے۔

مغل نظریۂ بادشاہت کے تحت جن فرائض کو پورا کرنے کی توقع بادشاہ سے کی جاتی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد میں مغل بادشاہوں نے سلطنت کے تئیں فرائض کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

اس کا ذکر اس عہد کے شعراء نے بھی کیا ہے۔ ان بادشاہوں کو رعیت کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جہاں سولہویں اور سترہویں صدی میں مغل بادشاہ اپنے آپ کو رعایا کا محافظ سمجھتے تھے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ سلطنت کا استحکام اور عوام کی بھلائی دو ایسے پہلو ہیں جس پر تقریباً سبھی ابتدائی مغل حکمرانوں نے زور دیا۔ لیکن اس عہد میں مغل بادشاہوں کو رعایا کے مصائب و آلام کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ محمد رفیع سودا نے اس پہلو کی عکاسی اسطرح کی ہے:

سنتا نہیں ہے بات رعیت کی بادشاہ(۱)

اسی طرح شعراء نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کس طرح سے مغل بادشاہوں کی لاپروائی کی وجہ سے لمحہ بھر میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں یعنی بادشاہت مغلوں کے ہاتھ سے نکلتی جارہی تھی جیسا کہ جرات نے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

عجب کیا انقلاب دہر کے ہاتھوں ملے پل میں
گداؤں کو شاہی اور شاہوں کو گدائی

اس طرح اورنگ زیب کا بالکل ٹھیک ماننا تھا کہ ایک لمحہ کی لاپروائی کئی سالوں کی

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۳۲، ص ۳۳۸

تباہی کا باعث ہوسکتی ہے۔ یہی غلطی اورنگ زیب کے بعد ہونے والے بادشاہوں نے کی انھوں نے کبھی بھی اس پہلو کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی نتیجہ ان کو بھگتنا پڑا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کنور پریم کشور فراقی کے حوالے سے اس عہد میں بادشاہ کی حیثیت کو ان الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے "قلعہ میں بادشاہ کے روبرو تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی تھی حد تو یہ ہے کہ چوکیدار اور فراش تک بادشاہ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ انندراؤ نے بادشاہ سے اجازت لیے بغیر مرہٹہ سردار پٹیل پر کچھ نقدی نچھاور کردی۔ تمام فراش اور چوکیدار نقدی لوٹنے پر ٹوٹ پڑے انھں بادشاہ کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوا۔ بادشاہ سر دربار خود بھی گالیاں دیتا اور اُن کے جواب میں فحش اور واہیات کلمات سنتا" (۱)

اس طرح بادشاہ کے گرتے وقار کی وجہ سے کم اہل لوگ حاوی ہو رہے تھے۔ حاتم نے اس پہلو کی عکاسی اس طرح کی ہے:

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے
جو چور تھے سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے (۲)

بادشاہ جس پر ملک میں یک جہتی قائم کرنے اور ترقی کا انحصار تھا۔ سلطنت کے تمام ادارے اسی کی شخصیت سے وابستہ تھے ان اداروں کی کامیابی اور ناکامی بادشاہ کے کردار پر منحصر تھی۔ بابر سے اورنگ زیب تک یکے بعد دیگرے جتنے بادشاہ ہوئے ان میں سلطنت چلانے کے تمام اوصاف موجود تھے۔ مگر عہد آخر میں سلطنت کی باگ ڈور ایسے

---

(۱) خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، دلی، جنوری ۱۹۶۶، ص ۳۹ بحوالہ کنور پریم کشو فراقی، وقائع شاہ عالم، رام پور، ۱۹۴۷، ص ۱۴۱ تا ۱۴۴

(۲) ظہور الدین حاتم، دیوان زادہ، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵، ص ۱۹۲

بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی جن کے لیے ہندوستان کا نظم ونسق تو بڑی بات ہے وہ اپنی محل سرا کا بندوبست تک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر خودغرض امراء نے بادشاہت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ وہ بادشاہ کی طاقت کو چیلنج کر رہے تھے۔ اس طرح ان بادشاہوں کی سلطنت کے تئیں غفلت شعاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔ وہ نہ صرف اپنے ہی امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے بلکہ دیگر طاقتوں کی سازشوں کا بھی شکار ہو گئے۔ حاتم نے اپنے ہمعصر مغل بادشاہ کی حالت کو اس شعر میں اس طرح نمایاں کیا ہے:

عجب یہ اُلٹی بھی ہے گی باؤ دلی میں
کہ شاہ باز، چڑی مار کی ہے انٹی میں(۱)

''ان بادشاہوں نے جو اورنگ زیب کے بعد مسند نشیں ہوئے، حالات کو اپنے قابو سے باہر دیکھا تو عیش وعشرت میں اُسی طرح غرق ہو گئے، جس طرح شتر مرغ ریگستانوں میں آندھیوں کے وقت ریت میں سر چھپا لیتا ہے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر زندگی گذارنے لگے'' (۲)۔ شاہ ولی اللہ جو اٹھارویں صدی کے اہم عالم گزرے ہیں، بادشاہت کے گرتے وقار پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اور بادشاہ کے فرائض کے بارے میں یاددہانی کرتے ہوئے لکھا ہے ''ایک بالاتر شخصیت ہو جس کو ان سب پر اقتدار اور تسلط حاصل ہو اور ان کو ضبط میں رکھنے کی طاقت رکھتا ہو ایسے شخص کو عام طور پر شہنشاہ اور شرع کی زبان میں خلیفہ کہا جاتا ہے۔ جس کا وجود اس وسیع تر تمدن کے نظام کو (جو مختلف حکومتوں کے پر مشتمل ہے) ٹھیک طریقے پر

(۱) ظہورالدین حاتم، دیوان زادہ، ص ۱۹۳، دراصل یہ شعر شاہ عالم ثانی سے متعلق ہے۔ ۱۷۷۱ء میں جب الہ آباد سے مرہٹوں کی مدد سے وہ دلی آیا تو اس وقت مرہٹوں کے ماتحت بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں تھا۔ یہاں چڑی مار سے مراد مرہٹے ہیں۔

(۲) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میر کا عہد، دہلی ۱۹۷۳ء ص ۲

قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے ایسی شخصیت کے ساتھ صوبجاتی حکومتوں کے لیے اس کی طاقت کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوتا ہے اور اس لیے وہ چار و ناچار اس کے احکام کے پابند اور مطیع رہتی ہیں۔ اگرچہ خلیفہ نظامِ صالح کا متبع ہو اور اپنی ماتحت حکومت کو سنتِ راشدہ پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو تو کچھ شک نہیں کہ ایسی مملکت بڑی خوش نصیب ہے"(۱)

"بادشاہ اور حکمراں کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں نہیں تو لوگ اس سے نفرت کریں گے اور کبھی بھی اس کو ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوگی، مثلاً اگر وہ شجاع اور جری القلب نہ ہوا تو دشمنوں کا اس سے مرعوب ہونا ممکن نہیں اور اپنی رعیت کی نظروں میں بھی وہ حقیر اور ذلیل ہوگا، اگر وہ متحمل مزاج اور بردبار نہیں تو اس کی تند مزاجی ملک کی بربادی کا باعث ہوگی"(۲)

شاہ ولی اللہ کی طرح سے محمد رفیع سوداؔ نے بھی بادشاہ کے فرائض کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہوئے لکھا ہے:

کسی گدا نے سُنا ہے یہ ایک شہ سے کہا
کروں میں عرض گر اس کو نہ سرسری جانے

امورِ ملک میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم
گدا نوازی و درویش پروری جانے

مقامِ عدل پہ جس دم سریر آرا ہو
ہر ایک خورد کلاں میں برابری جانے

وہی ہو رائے مبارک میں اس کے گوشہ نشیں
کہ جس میں عامہ خلقت کی بہتری جانے

---

(۱) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، حصہ اول، مترجم مولانا عبدالرحیم، لاہور (پاکستان)، ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۹
(۲) ایضاً " " ص ۲۸۹

چمن ہے ملک و رعیت ہے گل اُنھوں کے لیے
بسان ابر بسر سایہ گستری جانے
ہمیشہ جو دو کرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر
مساوی از امراتا لشکری جانے
بجا جو طرح سپاہی دے اس کو سمجھے مرد
نہ یہ کہ مرنے کو بیجا سپہ گری جانے(۱)

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغل بادشاہوں کا کردار اتنا گر گیا تھا کہ اگر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بادشاہ اب بھی موجود تھا لیکن بادشاہ میں اب وہ قابلیت موجود نہ تھی جو اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب میں تھیں۔ بادشاہ انتظامی امور اور میدان کارزار سے تھک کر کچھ وقت تفریح میں گزارتے تھے، ان کی عیش و عشرت اور ذمہ داری میں ایک توازن قائم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد سے تو مغل بادشاہوں میں یہ خصوصیت بالکل ختم ہوگئی تھی اور وہ اپنے فرائض سے بالکل غافل تھے۔ محمد شاکر ناجی کا کہنا ہے ؎

بڑے غافل ہیں صاحب نوبت اور سب ہند کے راجے
نکلتے نہیں علاقوں سیں مگر جب سر پر آ باجے(۲)

''اخلاقی کمزوریوں نے بادشاہ کو دروغ گو اور دروغ پسند بھی بنا دیا تھا'' (۳) جہاں بادشاہ کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہیں اس عہد میں نہ صرف امراء و وزراء بلکہ عوام کی نگاہ میں بادشاہ کے لیے عزت بالکل ختم ہوگئی تھی۔ شاکر ناجی نے مندرجہ ذیل شعر میں اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کے تخت پر جتنے بادشاہ اور اراکین سلطنت تھے وہ سب بے زور تھے مگر بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے تھے ؎

بساطِ ہند میں بے زور ہیں مہرے جتنے دیکھے
ہوئی جاتی ہے بازی مات وہ مشتاق سب شہ کے

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، ص ۱۷۷
(۲) محمد شاکر ناجی، دیوان شاکر ناجی، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۳۳۲
(۳) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، ص ۲۹۵

جعفر زٹلی، محمد شاکر ناجی کے علاوہ میر تقی میر، مصحفی، قائم چاند پوری وغیرہ شعراء نے مغل بادشاہوں کی کمزوری، غفلت شعاری اور ان کے کردار کو شاعری میں نمایاں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جابجا ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغل بادشاہوں کا زوال ہو رہا تھا۔

اورنگ زیب کے جانشین:

معظم (۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء)

معظم اورنگ زیب کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء میں تخت نشیں ہوا۔ لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں نہیں تھیں جو اس کے آباء و اجداد میں تھیں۔ وہ ہمیشہ انتظام سلطنت کی طرف سے غافل رہتا تھا۔ رات کو دیر تک جاگنا اور دوپہر تک سوتے رہنا اس کی روزمرہ کی زندگی میں معمول سا بن گیا تھا۔

> خافی خاں نے اس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے ''امور سلطنت کی خبر گیری اور بندوبست سے اس قدر لاپرواہ اور بے خبر رہتا تھا کہ شوخ طبع اشخاص نے اس کے جلوس کی تاریخ ہی ''شہ بے خبر'' نکالی تھی۔ سفر میں بھی اس کی آرام طلبی کا یہی عالم تھا، عموماً کوچ میں بڑی دیر ہو جاتی تھی، اندھیرے میں لشکر ادھر ادھر منتشر رہتا تھا۔ لوگوں کو اپنا سامان اور خیمے تک نہیں مل پاتے تھے'' (۱)

اس طرح جہاں اکبری و عالمگیری فتوحات نے جو شاہان مغلیہ کا وقار بلند کیا تھا وہ اورنگ زیب کے بعد معظم (بہادر شاہ) کی کمزوریوں اور فوج کی بدنظمی کی وجہ سے نیست و نابود ہونا شروع ہو گیا۔

---

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، مترجم محمود احمد فاروقی، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۸۱

جعفر زٹلی نے معظم کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

نختیں کلاں ترکہ برکھنڈ کرد
ہمہ کاروبارِ پدر بھنڈ کرد

جہاں ہووے ایسا کو لچھن کپوت
لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت(۱)

معظم کی سخاوت پسندی کی وجہ سے اس کے عہد میں مالی حالت بے حد ابتر تھی۔ اس نے شاہی خزانے کا زیادہ تر روپیہ خیرات میں تقسیم کر دیا۔ خافی خاں کا کہنا ہے کہ

''بہادر شاہ نے چار سال دو مہینے حکومت کی بادشاہی خزانے میں بہ اختلافِ روایات تیرہ کروڑ روپیہ رہ گیا۔ بہادر شاہ کے جلوس کے چوتھے سال کے اختتام تک وہ سب بخشش و عطیات میں صرف ہو گیا۔ بہادر شاہ کے زمانے خرچ اتنا زیادہ تھا کہ یہ نوبت آ گئی تھی کہ تمام دربار کے شعبوں خاص طور سے محلات شاہی میں خرچ کی تنگی رہتی تھی (۲)۔

اس کے کردار کے باعث نہ صرف شاہی وقار کو ٹھیس لگی بلکہ عوام بھی اثر انداز ہوئی کیونکہ عوام کے دلوں میں بادشاہ کے لیے عزت و احترام تھا اور وہ بادشاہ کو اپنے لیے مثال تصور کرتے تھے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ معظم انتظامی معاملات میں بالکل بے بہرہ اور امور ملکی سے ناواقف تھا۔ اس کی نااہلی کے بارے میں نہ صرف تاریخی مآخذ میں ذکر ملتا ہے بلکہ اردو شاعری میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے جیسے جعفر زٹلی کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جس سے کہ اس پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔ بہادر شاہ سے پہلے جتنے بھی مغل بادشاہ ہوئے انھوں نے مغل سلطنت کے وقار کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بہادر شاہ (معظم) کی وفات کے بعد جتنے بھی مغل

---

(۱) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، ص ۳۴

(۲) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، مترجم محمود احمد فاروقی، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲

حکمراں ہوئے (۱) وہ سبھی سیاسی طور پر بے حد کمزور تھے، امراء اور وزراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ان بادشاہوں کو امرا کے اوپر منحصر رہنا پڑتا تھا۔

یہ بادشاہ یا تو شراب نوشی میں محو رہتے تھے یا پھر ان میں کچھ بادشاہ لاعلاج بیماریوں میں مبتلا رہتے تھے (جیسے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ)۔ کچھ بادشاہوں کو تو سید برادران نے زبردستی بادشاہ بنایا تھا۔ جہاں ایک وہ زمانہ تھا جب تخت نشینی کے لیے مغل شہزادوں میں ہر بادشاہ کے مرنے کے بعد جنگیں ہوتی تھیں اور کہاں اٹھارویں صدی کے آغاز میں کوئی بھی شہزادہ ایسے انتشار کے ماحول میں بادشاہ بننے کو تیار نہ تھا۔ ہم عصر مورخین غلام حسین طباطبائی اور خافی خاں نے لکھا ہے ''

> اس وقت کوئی شہزادہ بادشاہ بننے کو تیار نہیں تھا، جہاندار شاہ کے بیٹوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔ نیکو سیر جو ایک مرتبہ اس مرحلے سے گزر چکا تھا، اس نے بھی انکار کر دیا۔ آخر کار بڑی مشکلوں سے رفیع الشان کے بیٹے ابراہیم کی خوشامد کر کے تیار کیا گیا'' (۲)۔

جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء):

جہاندار شاہ بہادر شاہ (معظم) کا بڑا بیٹا تھا۔ جو سیاسی طور پر بے حد کمزور اور ہمیشہ شراب نوشی میں

---

(۱) جہاندار شاہ.....۲۹/مارچ ۱۷۱۲ء تا ۱۱/جنوری ۱۷۱۳ء
فرخ سیر.......۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء تا ۲۷/اپریل ۱۷۱۹ء
رفیع الدرجات...۲۸/فروری ۱۷۱۹ء تا ۴/جون ۱۷۱۹ء
رفیع الدولہ (عرف شاہ جہاں ثانی) ۶/جون ۱۷۱۹ء تا ۱۷/دسمبر ۱۷۱۹ء
محمد شاہ رنگیلا.....۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء
احمد شاہ.........۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء
عالمگیر ثانی.....۱۷۵۴ء ۱۷۵۹ء
شاہ عالم ثانی.....۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء
اکبر ثانی.........۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء
بہادر شاہ ظفر.....۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء

(۲) خافی خاں، منتخب الباب، حصہ چہارم، ص ۳۵۲
غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، مترجم یونس احمد، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۱

محور رہتا تھا۔ سلطنت کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچتا تھا۔ خافی خاں نے جہاندار شاہ کے عہد کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے'

'جہاندار شاہ کا زمانہ ظلم وستم و فجور کا زمانہ تھا، گانے بجانے کی محفلیں جمنے لگیں، قوال دھاڑی گھروں سے نکل آئے، قریب تھا کہ قاضی صراحی اٹھا لے اور مفتی پیالہ تھام لے، بادشاہ کی محبوبہ لعل کنور کے کیا کہنے، بادشاہت تو اس کی تھی۔ اس کے بھائیوں اور دور ونزدیک کے رشتہ داروں کو چار ہزاری منصب ملے، ہاتھی نقارہ، قیمتی جواہر اور اعزاز عطا ہوئے، وہ قوم میں اتراتے پھرنے لگے کہ ہم بھی بادشاہ کے رشتہ دار ہیں۔ مراثیوں کی ڈوم دھاڑیوں کی اس ریل پیل میں قدیم خانہ زاد امیروں، باکمال اشخاص اور علماء کو کون پوچھتا'' (۱)۔

اس طرح رات کے وقت محل میں عیش ونشاط کی محفلیں سجتیں، نچلے درجے کے گویے محل میں جمع ہوتے اور جہاندار شاہ کے ساتھ شراب پیتے، نشے کی حالت میں یہ لوگ جہاندار شاہ کو تھپڑ اور لات تک مارتے، شہنشاہ عالمگیر کا پوتا یہ ساری ذلتیں لعل کنور کی خاطر برداشت کرتا۔ اس طرح اس عہد میں مغل بادشاہوں کی لاپرواہی کی وجہ سے نچلے طبقات ابھر رہے تھے۔ ان حالات کا ردعمل اس دور کی شاعری میں بھی ملتا ہے، حاتم کا کہنا ہے

تمام شہر میں گھٹوں کے مالک ہیں بزاز
اور آج سب میں بڑے خودنما ہیں آئینہ ساز (۲)

جہاندار شاہ کے عہد سے سیاسی اور تہذیبی زوال کی وہ شدت نظر آتی ہے جس کی انتہا محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں ملتی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جہاندار شاہ کا کردار سلطنت مغلیہ کے زوال کے لیے اہم وجہ بنا۔

---

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۱۳۹

(۲) ظہورالدین حاتم، دیوان زادہ، ص ۱۹۳

خافی خاں کا کہنا ہے "جہاندار شاہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی پہلی علامت تھا" (۱)۔

اس نے صرف گیارہ مہینے حکومت کی مگر اس نے سلطنت کی تین سو سالہ عزت و آبرو ایک طوائف (لعل کنور) کے قدموں پر نچھاور کر دی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ انتظام سلطنت کی طرف کوئی دھیان نہ دیکر ہمیشہ عیش پرستی میں ڈوبا رہتا تھا اور اکثر لعل کنور کے ساتھ دیر رات تک سیر کے لیے نکل جایا کرتا تھا جس کا ذکر خافی خاں نے بھی کیا ہے (۲)۔ مورخین جہاندار شاہ کے دور کو ایام جہالت کا دور کہتے ہیں۔ ذاتی زندگی میں نہ تو اس کو مذہب اسلام میں کوئی عقیدہ تھا اور نہ ہی وہ شریعت کے اصولوں کا پابند تھا وہ ایک بدکردار اور نا قابل بادشاہ ثابت ہوا جو اپنا سارا وقت رنگ رلیوں میں گزارتا تھا۔ میر سوز کا نصیحت آمیز مندرجہ ذیل شعر اسی رخ کی ترجمانی کرتا ہے ۔

چشم عبرت کھول کر کچھ دیکھ تو اے مست خواب
دہر نے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب

خلیق احمد نظامی نے لعل کنور کے متعلق لکھا ہے "اس کی ابروئے چشم کے اشارہ پر لوگوں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، کوئی ایسا اخلاقی، سماجی اور انسانیت کا گناہ نہ تھا جو اس عورت کے اثر میں نہ کیا گیا ہو" (۳)۔

---

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۱۵۵

(۲) جہاندار شاہ اکثر اپنی معشوقہ کو رتھ پر ساتھ بٹھا کر چند مقربوں صاحبوں کے ہمراہ بازاروں کی سیر کے لیے نکل جاتا تھا، شراب خانوں میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک رات اسی طرح وہ لعل کنور کو رتھ پر سوار کرا کر ایک شراب خانہ میں پہنچ گیا اور وہاں دونوں نے جی بھر کر شراب پی۔ جب لوٹنے لگے تو بالکل مست اور مدہوش تھے۔ محل واپس آئے تو رتھ سے اترتے وقت لعل کنر کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ بادشاہ کو اتار لیتی۔ گرتے پڑتے وہ اپنے بستر پر جا کر پڑ گئی اور نشہ میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ ادھر بادشاہ سلامت دنیا سے بے خبر رتھ میں مدہوش پڑے تھے (رتھ بان بھی ترنگ میں ہوگا) اس نے رتھ اصطبل میں لے جا کر کھڑا دی کچھ دیر بعد محل کی عورتوں نے لعل کنور کے ساتھ نہیں پایا تو دھوم مچا دی۔ اب ہر طرف بادشاہ کی تلاش ہونے لگی۔ آخر کار لوگوں نے اصطبل میں رتھ کے اندر بادشاہ کو محو استراحت پایا۔ اس واقعہ پر ہر جگہ یہ افواہ اڑ گئی کہ لعل کنور کے بھائی نے مستی کے عالم میں قتل کر دیا۔
(خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۱۴۰)

(۳) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، مئی ۱۹۵۳، ص ۳۵۸

اس کو امتیاز محل کا خطاب ملا ہوا تھا، نہ صرف اس کو اس قدر حقوق دیے ہوئے تھے بلکہ اسکے جملہ افراد کو جائدادیں اور خطابات ملے ہوئے تھے۔ انھیں امراء کی طرح اپنے دروازوں پر نوبت بجانے کی اجازت تھی۔ جس طرح عہد جہانگیری میں نور جہاں کا سکہ جاری تھا اسی طرح سے جہاندار شاہ کے عہد میں لعل کنور کے نام کا سکہ جاری تھا۔ اس طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جہاندار شاہ کا عہد در حقیقت مراثیوں، موسیقاروں، بھانڈوں وغیرہ جیسے کم اہل طبقات کا دور تھا۔ اس عہد میں ان طبقات کی بے حد اہمیت ہوگئی تھی۔ غلام حسین طباطبائی کا کہنا ہے

> ''لعل کنور نے زہرہ نامی ایک کنجڑن کو اپنی بہ اعتقاد ہندوگانہ بہن بنایا تھا، اس کو بھی لعل کنور کی وجہ سے شاہی محل میں اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ مادہ فیل پر سوار ہوکر حرم سرا تک بے خوف وخطر جاتی۔ یہ اعزاز صرف شہزادیوں یا بادشاہی خاندان کی بیگمات کو ملا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ جو ہمراہ ہوا کرتے تھے وہ بھی اپنی حد سے گذر کر ضعیف عورتوں پر طعنے کستے''(۱)۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں کہاں ان طبقات کو ان کی حیثیت کے مطابق عہدے ملے ہوئے تھے۔ اٹھارویں صدی میں بادشاہ کی سیاسی کمزوری کے باعث یہ طبقات مغل بادشاہوں پر قابض ہورہے تھے۔ میر تقی میر نے اس پہلو کی عکاسی مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح کی ہے۔

اب وے مختار کے ہوئے مختار
ان پر ٹھہرا ہے سلطنت کا مدار
وہی اس عہد میں ہیں کاربرآر
اس طرف سے مرا ہوا جو گزار
نکلے سن نام بہر استقبال(۲)

---

(۱) غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۳۹
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۱ء، ص ۹۵۵

جہاندار شاہ کا عہد زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس کے بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر سکہ جاری کیا اور سید برادران کی مدد سے جہاندار شاہ کو شکست دینے میں کامیاب رہا اور جہاندار شاہ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا ''ایک مغل سپاہی نے بھاری جوتے پہن کر اس کے سینے کو روند کر ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالیں پھر جہاندار شاہ اور اس کے وزیر ذوالفقار کی لاشیں دلی دروازے کے سامنے والے میدان میں پھینک دی گئیں جہاں وہ تین دن تک بے گور و کفن اسی حالت میں پڑی رہیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے چھ سال کے قلیل عرصے میں یہ تیسرا خونی انقلاب تھا جسے دلی والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا'' (۱)۔

فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء):

سید برادران (۲) کی مدد سے ۱۷۱۳ء میں اپنے چچا جہاندار کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ درحقیقت وہ بھی ایک برائے نام بادشاہ تھا۔ سلطنت کی تمام طاقتیں سید برادران عبداللہ اور حسین علی خاں کے ہاتھ میں تھیں۔ فرخ سیر ایک غیر مستقل مزاج بادشاہ تھا وہ کبھی ایک بات پر قائم نہیں رہتا تھا، کبھی تو مدارات سے پیش آتا تو کبھی مخالفین کا قلع قمع کر دینے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ بقول خافی خاں

> ''مغل سلطنت کے دور زوال کا تیسرا تخت نشین بادشاہ تھا، جس نے سادات بارہہ کی دست درازیوں سے سلطنت مغلیہ کے تخت و تاج کو بچانے کی کوشش کی اور اسی جدوجہد میں وہ درباری سازشوں کا شکار ہوگیا'' (۳)۔

---

(۱) ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، نظیر آباد لکھنؤ، ۱۹۷۳ء، ص ۱۴

(۲) سید برادران کے والد سید میاں اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بیجاپور اور اجمیر کے صوبہ دار تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں ہونے والی تخت نشینی کی جنگ میں سید برادران نے شہزادے معظم کا ساتھ دیا۔ ۱۷۰۸ میں شہزادہ عظیم الشان نے عبداللہ خاں کو الہ آباد اور حسین علی کو بہار کے صوبوں میں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا ان ہی احسانات کے بدلے انھوں نے عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کو تعاون دیا۔

(۳) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۱۵۶

اس نے سید برادران سے چھٹکارا پانے کی کئی بار کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ سید برادران کے خلاف ساز باز کرنے کی وجہ سے اسے اندھا کر دیا گیا۔ اس کے عہد میں سلطنت کا توازن بالکل بگڑ گیا تھا۔ وہ ایک ناتجربہ کار بادشاہ تھا۔ اختیارات کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے اس کا سلیقہ نہیں تھا۔ ہمیشہ دوسروں کی بات پر چلتا تھا۔ ایسی صورت میں بادشاہ کا کوئی وقار نہیں رہا۔ وہ بار بار امراء کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا۔ چنانچہ اس کے عہد میں جو پریشانیاں پیدا ہو رہی تھیں، جس کا سامنا ہر ایک طبقہ کر رہا تھا۔ اس دور میں غلہ کی گرانی خاص طور پر تکلیف کا باعث تھی، جعفر زٹلی نے اس پہلو کے بارے میں اس طرح سے عکاسی کی ہے

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ ہے تسمہ کش فرخ سیر(۱)

کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر نے زٹلی کو اس طنز کی وجہ سے قتل کروایا تھا۔ بشیر الدین احمد نے فرخ سیر کے عہد کا ایک قابل ذکر واقعہ اس طرح تحریر کیا ہے "۱۷۱۶ء میں بادشاہ بیمار ہوا، علاج کے لیے ایک اسکاٹ لینڈ کا ڈاکٹر ہیملٹن گیرل طلب کیا گیا جس کے علاج سے صحت کامل ہوئی۔ بادشاہ نے اپنی صحت کی خوشی میں ڈاکٹر سے کہا مانگو کیا مانگتے ہو۔ ڈاکٹر اپنی قوم کا فدائی تھا اس نے ذاتی منفعت کے بجائے قومی بہتری کو ترجیح دی اور عرض کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو محصول درآمد لیا جاتا ہے اس کی معافی کا فرمان عطوفت نشاں مرحمت فرمایا جائے اور اس کے معاوضے میں کوئی سالانہ رقم یکمینہ مقرر ہو جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کمپنی کے حقوق تسلیم کیے جائیں۔ اس مراعات نے کمپنی کے پاؤں جما دیے"(۲)۔ فرخ سیر کا انجام بے حد دردناک ہوا۔ اس کو جس بے رحمی سے گرفتار کیا گیا وہ بیان سے باہر ہے۔ خافی خاں نے بھی سید برادران نے جو بدسلوکی فرخ سیر کے ساتھ کی تھی اس کا ذکر حسب ذیل عبارت میں اس طرح کیا ہے۔

"جب مظلوم بادشاہ فرخ سیر دربار سے اٹھ کر محل میں چلا گیا اور رات ہوئی تو سید عبداللہ خاں اور سنگدل راجہ اجیت سنگھ افغانوں کی ایک جمعیت اور

---

(۱) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، ص ۹

(۲) بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول، دہلی، ۱۹۱۹، ص ۶۲۴

دوسرے سرداروں کے ساتھ قلعہ ہی میں رہ گئے مگر رات بھر وہ بیم اور رجا کی حالت میں تھے کہ نہ جانے صبح ہونے تک کیا حادثہ رونما ہوتا ہے۔ جب صبح ہوئی تو قلعہ کے باہر ہنگامہ اور شورش کی اطلاع ملی۔ قطب الملک وغیرہ نے پیغام بھیجے اور سبز باغ دکھائے کہ کسی طرح محل سے باہر آ جائے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ محل پر حبشی اور ترکی کنیزوں کی فوج جنگ کے لیے مستعد ہوگئی۔ آخر کار قطب الملک کے چھوٹے بھائی نجم الدین علی خاں اور صلابت خاں نے روہیلہ کا بیٹا اور چند دوسرے نمک حرام سردار پٹھانوں کے چیلوں کو لے کر محل میں گھس گئے۔ فرخ سیر بادشاہ بڑی تلاش کے بعد محل کی چھت پر ایک کونے میں دبکا ہوا تھا اور محل کی عورتیں اس کے اطراف تھیں۔ حملہ آوروں نے عورتوں کو دھکے دے کر ہٹایا اور بادشاہ کو بڑی بے حرمتی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لے آئے۔ بادشاہ کی والدہ، بیوی، لڑکی اور دوسری بیگمات مظلوم و مغموم بادشاہ کو گھیرے ہوئے تھیں، بچاریاں پٹھانوں اور اور چیلوں کے پاؤں پر گر گئیں اور ان کی منت و خوشامد کرنے لگیں۔ اس وقت سارا محل چیخ پکار، آہ و زاری اور فریادوں سے گونج رہا تھا۔ محمد فرخ سیر بادشاہ کو عورتوں کے ہجوم میں سے بڑی بے حرمتی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور اسے اندھا کر دیا۔ قلعہ میں تیر پولیہ پر ایک قید خانہ تھا جسے قبر کی طرح زمین دوز بنایا گیا تھا۔ یہ نہایت تنگ و تاریک جگہ تھی۔ بادشاہ کو اس قبر نما قید خانہ میں زندہ درگور کر دیا گیا۔ اسکو صرف ایک طشت اور آفتابہ قضائے حاجت کے لیے اور پانی کی صراحی دے دی گئی۔ بس یہی چیزیں قید خانہ میں اس کی رفیق تھیں۔ (۱)

اس طرح جہاں ان سید برادران نے جہاندار شاہ کے خلاف فرخ سیر کا ساتھ دیا وہیں

---

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۲۶۲ تا ۲۶۳

اس وقت سید برادران کے ہاتھوں اس کو قید کیا گیا۔ میر سوز کے مندرجہ ذیل شعر سے اس پہلو کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔

کسی کو رتبہ پر چڑھایا ہے تو دو دن میں
مثال اوج فوارہ وہیں الٹا گرا دیکھا

اس طرح فرخ سیر کے بعد تین بادشاہ یکے بعد دیگرے سید برادران کی مرضی سے تخت نشین ہوئے۔ رفیع الدرجات کو ۱۷۱۹ء میں قید سے نکال کر بادشاہ بنایا گیا۔

بقول خافی خاں ''یہ واقعہ بڑا عبرت ناک تھا کہ ایک بادشاہ کو تخت سے اتار کر قید میں ڈال دیا گیا اور دوسرے کو سات سال کی قید سے نکال کر تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا'' (۱)

جب ہم فرخ سیر کے عہد پر نظر ثانی کرتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائے سلطنت ہی میں فتنہ و فسادات کا دروازہ کھول دیا تھا اور جو کچھ پیش آیا اسے بھگتنا پڑا۔

سیّد برادران اور سیاست:

۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۰ء تک سید برادران عبداللہ خاں اور حسین علی خاں نے مغل سیاست میں اہم کردار نبھایا۔ انھوں نے جب چاہا کسی کو بادشاہ بنایا اور جب چاہا اسے تخت سے اتار دیا۔ اسی وجہ سے تاریخ میں ان کو ''بادشاہ گر'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولوی بشیر الدین کا کہنا ہے ''ان سیدوں نے بادشاہت کا کھیل بنا رکھا تھا'' (۲)۔ بقول خافی خاں ''درباری سیاست کا رنگ یہ تھا کہ سید عبداللہ خاں اور امیر الامراء سید حسن علی خاں دونوں بھائی یہ چاہتے تھے کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے، منصب اضافہ اور عہدے ان ہی کی ایما پر دیے جائیں'' (۳)۔ اس طرح سید برادران اپنے فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی مرضی سے بادشاہ

(۱) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۲۶۳ تا ۲۶۴
(۲) بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، حصہ اول، ص ۶۲۹
(۳) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۱۸۷

بناتے لیکن جب یہی بادشاہ ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تو ان کو قتل کرادیا جاتا۔

رفیع الدرجات۔(۲۸ فروری ۱۷۱۹ء تا ۶ رجون ۱۷۱۹ء):

شمس الدین ابوالبرکات رفیع الدرجات کو سید برادران نے تخت پر بٹھا تو دیا لیکن تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے جیسا کہ وہ کرتے آرہے تھے، وہ صرف نام کا بادشاہ تھا ''جس وقت یہ انقلاب برپا ہوا رفیع الدرجات قید میں تھا اور مرض دق میں مبتلا تھا، دونوں سادات بھائیوں نے اسے قید سے نکالا اور اس جلدی میں کہ حمام کرنے اور لباس تبدیل کرنے تک کی مہلت نہیں دی، اسی لباس میں جو وہ پہنے ہوئے تھا لے جا کر تخت پر بٹھا دیا''(۱) اس کا انتظامِ سلطنت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔''وہ بچارہ تو بس ایک طلسمی تصویر کی طرح تھا جسے تخت پر رکھ دیا گیا ہو، وہ بادشاہ نہیں بادشاہت کی پرچھائیں تھا''(۲) جہاں سولہویں اور سترہویں صدی میں امراء و وزراء بادشاہ کے ماتحت تھے۔لیکن اس عہد میں مغل بادشاہ اپنے ہی امراء پر منحصر تھے۔اس طرح ان بادشاہوں کو ان کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا تھا۔

رفیع الدولہ۔(۶ رجون ۱۷۱۹ء تا ۱۷ رستمبر ۱۷۱۹ء):

رفیع الدرجات کے بعد اس کا بڑا بھائی رفیع الدولہ تخت نشیں ہوا۔وہ اپنے بھائی کی طرح نام کا بادشاہ تھا۔تمام اختیارات سید برادران کے پاس تھے۔درحقیقت رفیع الدولہ بھی کٹھ پتلی بادشاہ تھا۔دراصل بادشاہ تو سادات بارہہ تھے۔رفیع الدولہ کی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے خافی خاں نے تحریر کیا ہے''چراغ سحری جو جھلملایا اور بجھ گیا''(۳) اس طرح فرخ سیر کے بعد تخت پر بیٹھنے والے یہ نوعمر بادشاہ سید برادران کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی تھے۔وہ تو نہ آزادانہ لوگوں سے مل سکتے تھے اور نہ کہیں آجا سکتے تھے۔مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۷۱۳ سے ۱۷۲۰ تک سلطنت کا نظم و نسق پوری طرح سے سید برادران کے ہاتھ میں رہا۔محمد رفیع سودا نے اس عہد میں

---

(۱) خافی خاں، منتخب الباب، حصہ چہارم، ص ۲۶۶

(۲) ایضاً ص ۲۷۶ تا ۲۷۷

(۳) ایضاً ص ۲۸۶

بادشاہ کی دن بدن گرتی ہوئی حیثیت کو مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح نمایاں کیا ہے۔

جو شخص نائب داور کہائے عالم میں
یہ کیا ستم ہے نہ آئین داوری جانے

سوائے ان سخنوں کے جو تاج زریں کو
خیال اپنے میں سردھر کے سروری جانے

یہ فخر تاج تو یوں نزد فہم ہے جس طرح
خروس آپ کو سلطان خاوری جانے (۱)

محمد شاہ رنگیلا۔ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء):

محمد شاہ رنگیلا کا اصلی نام روشن اختر تھا۔ اس کے عہد میں مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ یہ بادشاہ فطرتاً بزدل، عیش پرست اور کاہل تھا ''افیون کھا کھا کر اپنی تندرستی اتنی خراب کر لی تھی کہ چلنا پھرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ہاتھیوں کی جنگ دیکھ کے دل بہلاتا اور امور مملکت سے تغافل برتتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے عام طور پر اپنے درباری امراء اور خاص طور پر کچھ منظور نظر کو بے حد حقوق تفویض کر دیے تھے۔ (۲) وہ بے حد فضول خرچ تھا اور ملک کی آمدنی کو سال کے آخر تک خرچ کر لیتا تھا اس کی فضول خرچی کا اثر ملک کی اقتصادی حالت پر پڑ رہا تھا۔ میر تقی میر کے مندرجہ ذیل شعر سے اس پہلو کی عکاسی ہوتی ہے:

اس کے اوپر ہے شبہ تماشائی
اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رسوائی
کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لا خیمے کے گردو [illegible] پال (۳)

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۳۲، ص ۱۷۷

(۲) محمد عمر، اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی، ۱۹۷۳، ص ۱۵

(۳) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۱، ص ۹۵۸

درگاہ قلی خاں نے کمال بائی، نور بائی، وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو محمد شاہ کی منظور نظر تھیں ان میں اُدھم بیگم جو محمد شاہ کے لئے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔ بادشاہ نے اس کو شاہی حرم سرا میں اہم مقام دیا ہوا تھا۔ خافی خاں نے اس کے کردار کے بارے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے "وہ شخص بڑا نکتہ سنج تھا جس نے محمد شاہ کو "رنگیلے" کا نام دیا" (۱) اس کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے ستون ایک ایک کر کے گرتے رہے اور محمد شاہ اس زوال کو محض تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ تقریباً تیس سال کے عرصے میں مغلیہ سلطنت بکھر کر رہ گئی اس لئے محمد شاہ کو "خاتم السلاطین بابریہ" کہا جاتا ہے۔ مغل سلطنت کو تباہی سے بچانے کا امکان اگر ہو سکتا تھا تو اس کے لمبے دور حکومت میں ممکن ہو سکتا تھا۔ اس دور میں آئے دن اقتدار کی تبدیلی نہیں ہوئی جیسا کہ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۹ء تک کے درمیانی عہد میں ہوتا رہا۔ جس وقت محمد شاہ تخت نشین ہوا اس وقت عوام کے دلوں میں سلطنت کے لئے احترام باقی تھا۔ یہ ایک اہم سیاسی حقیقت تھی کہ شمالی ہندوستان کے نظم ونسق میں ابتری ضرور پھیلی تھی لیکن اس کا شیرازہ ابھی بکھرا نہیں تھا۔ مرہٹہ سرداروں کا اقتدار اس وقت صرف دکن تک ہی محدود تھا اگر سلطنت طاقتور اور دور اندیش بادشاہ کے ہاتھوں میں ہوتی تو شاید مغل سلطنت اتنی تیزی سے زوال پذیر نہیں ہوتی۔ لیکن محمد شاہ میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ تھی وہ غیر سنجیدہ اور عیش طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے سلطنت کے امور کی طرف سے ہمیشہ غفلت برتی اور نظام الملک جیسے قابل وزیروں کی حمایت حاصل کرنے کے بجائے ناکارہ خوشامدیوں کے غلط اثر کا شکار ہو کر خود اپنے ہی وزیروں کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ "اس نے تیس سال تک بادشاہت کی۔ وہ سلطنت مغلیہ کا فرمانروا تھا مگر اس کی بادشاہت کا انحصار نظام الملک آصف جاہ اور اس کے بیٹوں کی تدبیر وشجاعت پر تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو محمد شاہ کا وہی حال ہوتا جو مظلوم فرخ سیر کا ہوا (۲) اس طرح حکومت کی طرف سے غفلت برتنے کے باعث بادشاہ امراء اور وزراء کا محتاج ہو گیا۔ ایسی صورت میں مغل بادشاہت کا وقار گر گیا۔ شاہی خزانہ عیش پرستی میں ختم

---

(۱) خافی خاں، منتخب الباب، حصہ چہارم، ص ۴۱۷

(۲) خافی خاں، منتخب الباب، حصہ چہارم، ص ۴۱۷

ہوگیا۔جس کی وجہ سے سلطنت مالی طور بیحد کمزور ہوگئی۔شاکرناجی کا محمد شاہ کے بارے میں کہنا ہے

ہے فتح اوس کی جس کے سر پر ہوا روشن اختر
دکن تلک بچاوے گر ہو مدد ستا را (۱)

محمد شاہ کے عہد میں ہی نادر شاہ درانی کا حملہ ہوا۔اس حملے کی وجہ سے مغل بادشاہت کا وقار اور بھی کم ہوگیا اس طرح سبھی بیرونی، داخلی طاقتوں کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ مغل بادشاہت پوری طرح مفلوج ہوگئی ہے''محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا اور کچھ نہیں اس طرح رہا سہا تقدس اس کی وفات کے بعد ختم ہوگیا۔اقتصادی بدحالی کی وجہ سے بادشاہت کا وقار بالکل گر گیا تھا۔اس وقت بادشاہ کی طاقت کا کسی کو بھی ڈر نہیں تھا۔ اس طرح سلطنت میں اسکا عمل دخل ختم ہوگیا تھا۔
جعفر علی حسرتؔ نے اس پہلو کی مندرجہ ذیل شعر میں اس طرح ترجمانی کی ہے

ہے بادشاہ ہی فقط مور چھل چھتر پر اب (۲)

اس طرح جعفر علی حسرت کے اس مصرعے سے یہ بات تو بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت مغل بادشاہت صرف دو شاہی علامت کے ارد گرد گھوم رہی تھی یعنی بادشاہ کا اقتدار اس وقت برائے نام تھا۔

احمد شاہ-(۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء):

احمد شاہ کے عہد میں حالات اور بھی نازک ہوگئے۔سلطنت کی ساخت پہلے سے بھی زیادہ گر گئی۔احمد شاہ کی لاپرواہی کی وجہ سے سلطنت کا ہر ایک ادارہ متاثر ہورہا تھا۔ا سے نہ تو جنگی امور میں تجربہ تھا اور نہ ہی انتظام سلطنت میں''بچپن سے لے کر ۲۱ سال کی عمر تک (تخت

(۱) محمد شاکرناجی،دیوان شاکرناجی،مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق،دہلی،۱۹۶۸ء،ص ۳۴
(۲) جعفر علی حسرت،کلیات حسرت،مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،لکھنؤ،۱۹۶۶ء،ص ۵۶

نشینی کے وقت) اس کی پرورش عورتوں کے بیچ میں ہوئی'' (۱) وہ شراب نوشی میں اس حد تک محو رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ سلطنت کی طرف کوئی دھیان نہیں دے پاتا تھا۔ حکومت سے متعلق سبھی مسائل کا حل اور مقدمات کے فیصلے جاوید خان سے کراتا تھا۔ اور خود سر سے پیر تک نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ بادشاہ کا ذہن غیر تہذیب یافتہ اور کم اہل لوگوں کی طرف مائل ہونے لگا۔ احمد شاہ نے کبھی بھی مغل سلطنت کے وقار کو برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تو بس موسیقی میں محو رہتا تھا۔ اظفری نے موسیقی کے تئیں اس کے شوق کو اس طرح نمایاں کیا ہے۔

''(آہ) مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب کہ دلی کے باکمال استادوں سے کیسے کیسے گانے سننے میں آتے تھے۔ خاص کر ایک بار خلوت میں احمد شاہ بادشاہ بن محمد شاہ فردوس آرام گاہ اور شاہجہاں ثانی یعنی محی الملۃ ابن محی السنۃ ولد محمد کام بخش اور شاہزادہ محمد جام بخش بن شہزادہ کام بخش موصوف سے ایسے گانے سنے ہیں کہ پھر ان کی جیسی رس بھری اور دل گداز آوازیں آج تک ہمارے کانوں کو سننے میں نہیں آئیں (۲)

اسطرح احمد شاہ کے کردار کے اس پہلو کے باعث مغل بادشاہت کا وقار نیست و نابود ہو گیا نہ صرف امراء وزراء بلکہ عوام کے دلوں سے بھی مغل بادشاہوں کے لئے عزت ختم ہو گئی۔ اب سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا جیسا مصحفی نے لکھا ہے:

کہتے ہیں جسے سلطنت، القصہ کہ یارو
نے نام ہے اس چیز کا نے اب تو نشاں ہے (۳)

(۱) जदुनाथ सरकार: मुगल साम्राज्य का पतन, प्रथम खण्ड, अनुवादक मथुरालाल शर्मा, आगरा, 1972, पृ० 178
(۲) محمد ظہیر الدین اظفری، واقعاتِ اظفری، مترجم عبدالستار، مدراس، ۱۹۳۷ء، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷
(۳) غلام ہمدانی، دیوان مصحفی، مرتبہ و منتخبہ امیر لکھنوی و امیر مینائی، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶

خواجہ سرا جاوید خاں کا عروج:

احمد شاہ کے عہد میں خواجہ سرا جاوید خاں کا سیاسی معاملات میں عمل دخل کافی حد تک بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے اقتدار کو وسیع کرنے کی غرض سے بادشاہ کے لئے حرم عورتوں سے بھر دیا تھا۔ جتنے اختیارات اس عہد میں جاوید خاں کو ملے ہوئے تھے اتنے شاید امراء کو بھی نہیں ملے تھے اس کو ''نواب بہادر'' کا خطاب ملا ہوا تھا امراء و وزراء اور دیگر اعلیٰ افسران کو اپنی درخواستیں اسی کے (جاوید خاں) ذریعے بادشاہ تک پہنچانی پڑتی تھیں۔ اس طرح احمد شاہ کے عہد میں حکومت کا انحصار ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں تھی جس نے نہ تو کبھی زندگی میں سلطنت کا انتظام چلایا اور نہ ہی کوئی لڑائی دیکھی تھی۔ لیکن اب یہ حال تھا کہ سلطنت کے ہر ایک شعبہ میں اسی کے احکامات کی تعمیل کی جاتی تھی۔ جب بادشاہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں اپنے امراء و وزراء کو جاوید خاں کے پاس بھیجتا تو وہ اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے کہ ان کو کام کے لئے ایک خواجہ سرا کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے ان میں بدامنی پھیل رہی تھی۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں مغل بادشاہت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس طرح اس نے اپنے آباء واجداد سے چلے آرہے بادشاہت کے اصولوں کو نظر انداز کیا۔ بادشاہ کی حیثیت انتظام سلطنت میں اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ وہ سلطنت کے مختلف شعبوں کے درمیان توازن بنائے رکھنے کے لئے اہم کڑی تھا۔

سیاست میں اودھم بیگم (۱) کا دخل:

جاوید خاں کے علاوہ احمد شاہ نے اپنی ماں اودھم بائی کو سلطنت کے تمام معاملات میں لامحدود اختیارات دیئے ہوئے تھے۔ تخت نشینی کے بعد احمد شاہ نے اسے 'بائی جیو صاحب' نواب قدسیہ صاحب الزمانی اور حضرت قبلہ و عالم جیسے خطابات سے نوازا۔ اس کا سیاست میں پورا پورا دخل تھا۔ وہ نہ صرف فرمان جاری کرتی تھی بلکہ فیصلے بھی صادر کرتی تھی۔ جادو ناتھ سرکار نے

---

(۱) محمد شاہ رنگیلا کی بیوہ تھی جو پہلے ایک رقاصہ تھی۔

تاریخ احمد شاہی کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

''جاوید خاں نامی خواجہ سرا سے اس کا گہرا تعلق تھا اس سے شاہی تہذیب اور عوام کے جذبات کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ جاوید خاں کا حوصلہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ کہ وہ رات کو بھی شاہی حرم سرا میں ہی رہا کرتا تھا جو شاہی اصولوں کے خلاف تھا۔ یہ برائی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ شاہی پہریداروں نے جنہیں ایک سال سے زیادہ کی تنخواہ نہیں ملی تھی، انہوں نے شاہی دروازے پر ایک جوان گدھا اور کتیا کو باندھ دیا اور جب سردار اور باقی لوگ دربار میں حاضر ہونے کے لئے آتے تو ان سے کہتے کہ ''پہلے ان کو سلام کیجئے (مراد گدھا اور کتیا) یہ (گدھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) نواب بہادر شاہ ہیں اور یہ (کتیا کی طرف اشارہ کتے ہوئے) نواب قدسیہ ہیں''(۱)

غرض کہ احمد شاہ بادشاہ کے دور میں ملک زبوں حالی اور پریشانیوں کا شکار رہا اور خود اس کی زندگی ''ناؤ و نوش'' اور ''جنگ درباب'' کی نذر ہوگئی۔ اس کی ان کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر اسی کے امراء نے سلطنت میں دخل اندازی کرنی شروع کر دی۔ صفدر جنگ نے پہلے خواجہ سرا کو دھوکہ سے قتل کرایا اس کے بعد عماد الملک نے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا اور تخت سے معزول کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔

میر تقی میر نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر مندرجہ ذیل شعر قلم بند کیا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کے
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں (۲)

---

(1) जदुनाथ सरकार: मुगल सम्राज्य का पतन, प्रथम खण्ड, अनुवादक मथुरालाल शर्मा, आगरा, 1972, पृ० 182

(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۱۰۳

جہاں بادشاہ کی پیروں کی دھول جواہر کی مانند ہوا کرتی تھی لیکن اس عہد میں بادشاہ کے سیاسی طور پر کمزور ہونے کے باعث وہ اپنے ماتحت امراء کے زیر اثر ہو گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں بادشاہ سیاسی طور پر کمزور ہوا وہیں امراء نے بادشاہ کو اپنے زیر اثر کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور یہی احمد شاہ بادشاہ کے ساتھ بھی ہوا کیونکہ اس نے امور سلطنت کی طرف سے غفلت برتی اور انتظام سلطنت کا اختیار کم اہل لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس کا انجام اسکو بھگتنا پڑا۔ اظفری کا کہنا ہے

"جس زمانے میں احمد شاہ کو تخت سے معزول کر کے ان کی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھیری گئی ایک آنکھ میں کس قدر بصارت باقی تھی۔ ذرذرا لکھ پڑھ لیتے تھے۔ اس وقت میں پیدا ہی ہوا تھا۔ بادشاہ معزول نے اسی گوشے میں جہاں ہم سب بھی مقید تھے اپنی زندگی کے دن تقریباً انیس سال گذارے" (۱)

جعفر علی حسرت نے بادشاہ کی محتاج زندگی کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت اور تاج
وہ اپنی قوت کو اطفال کے ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج
غنیم آن کے لئے اس سے اس کے شہر سے باج
وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال (۲)

محمد عزیز الدین عالمگیر ثانی (۳) (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء):

یہ بادشاہ فطرتاً متضاد خوبیوں کا مالک تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنے پردادا اورنگ زیب

---

(۱) محمد ظہیر الدین اظفری، واقعات اظفری، ص ۱۸۷

(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۶

(۳) معزالدین جہاندار شاہ کا بیٹا تھا اور شاہ عالم اول کا پوتا تھا۔ اس کی پیدائش ۱۶۹۹ء میں ملتان میں ہوئی۔ جب ۱۴۰۰ سال کا تھا تو گھریلو جنگ میں اس کے والد مارے گئے۔ جس وقت وہ تخت نشین ہوا اس کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔

عالمگیرم کے نقوش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہیں دوسری طرف کمزور عقاید رکھتا اور پیروں فقیروں کو بہت مانتا تھا ان حالات میں وہ مغل سلطنت کو مستحکم نہیں کر پایا اس کے عہد میں عماد الملک کا اقتدار حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا سلطنت کا انحصار اسی پر تھا۔ عالمگیر ثانی کی بادشاہت بالکل ہی جھوجری تھی نام کے بادشاہ یہ تھے اور کام کے غازی الدین خاں، صفدر جنگ ۱۷۵۴ء میں انتقال کر گئے۔ غازی الدین اب بے کھٹکے ہو گئے۔ ملک پر ملک نکلتا جاتا تھا۔ سلطنت اب گھٹتے گھٹتے دلی کے اطراف کے چند اضلاع پر محدود رہ گئی پنجاب جا ہی چکا تھا اور باقی جو ملک رہا وہ سارے کا سارا مرہٹوں کا تھا'' (۱) حاتم نے عالمگیر ثانی کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:۔

حق کے ہوتے غیر سے کیا آشنائی کیجئے
چھوڑ وہ در کس کے در پر جبہ سائی کیجئے

مسند سالوس سے زاہد نہیں ہے شان فقر
بوریے پر بیٹھے اور بے ریائی کیجئے

کوہکن نے کیا ہوا پھوڑا اگر پتھر سے سر
کام یہ ہے کوہ غفلت رائی کائی کیجئے

چشم بینا دے خدا تو چاہیے مانند چشم
اپنے گھر بیٹھے ہوئے سیر خدائی کیجئے

بندگی میں شرط ہے بندے کو تسلیم و رضا
سلطنت بخشے خدا تو کیوں گدائی کیجئے

ہر کسے را بہر کارے ساختند مشہور ہے
کام اپنا چھوڑ کر کیوں جگ ہنسائی کیجئے

---

(۱) بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت، دہلی حصہ اول، دہلی، ۱۹۱۹ء، ص ۶۵۷ تا ۶۵۹

چاہیے لیجئے شجر سخاوت سے ثمر
اپنی نامقدرسب مطلب روائی کیجئے
اصل کو دیکھا تو ہے یک قطرۂ اب منی
آئینہ کیا دیکھے کیا خود نمائی کیجئے

شاہ عالم گیر کا مصرع ہے حاتم رمز عشق
دل میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجئے (۱)

اس کے عہد میں ناکارہ اور نکمّے لوگ برسر اقتدار ہونے لگے تھے حالانکہ یہ بات کوئی نئی نہیں تھی اورنگ زیب کے بعد سے سلطنت کا انحصار کسی نہ کسی امراء پر ہی تھا۔ میر تقی میر کا کہنا ہے کہ ''بہت سے نالائق اور کمینے لوگ برسر اقتدار آ گئے جو کچھ ہوا بے جا ہوا صمصام الدین جو عقل سے بالکل کورا تھا امیر الامراء بن بیٹھا'' (۲) عالمگیر ثانی کو بھی انتظام سلطنت کا کوئی تجربہ نہ تھا'' وہ صاف کہا کرتا تھا کہ ''میں اپنے وزیر کے ہاتھ کا کھلونا ہوں۔ مجھ میں حکومت کرنے کی طاقت نہیں ہے'' (۳)

اس کے عہد میں امورِ سلطنت کا دارومدار عماد الملک پر تھا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے لیکن یہ بھی عالمگیر ثانی سے کہیں زیادہ سیاسی طور پر کمزور تھا عالمگیر ثانی میں اپنی خواہش کو منوانے یا اپنے فیصلوں کو صادر کرنے کا حوصلہ تک نہیں تھا۔ اس عہد میں عوام بالکل بھی خوشحال نہیں تھی۔ انتظام سلطنت تو خراب پہلے سے ہی تھا اب اور بھی خراب ہو گیا۔ سلطنت کا اعلیٰ حکمراں ہوتے ہوئے بھی اسکو مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جادو ناتھ سرکار نے تاریخ عالمگیر ثانی کے حوالے سے عالمگیر ثانی کی خستہ حالت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے'' جب اس نے دیوان عام میں اپنا یوم پیدائش کا دربار کیا تو اس کی ابتر حالت نمایاں ہو گئی۔ شاہ جہاں کا بنوایا ہوا ہیرے جواہرات سے بنا ہوا تخت طاؤس اب نہیں رہا تھا اس کی جگہ اب لکڑی کا بنا ہوا تخت تھا سونے اور جواہرات کی جلد اب سستی رنگین تصویروں نے لے لی تھی (۴)

---

(۱) ظہور الدین حاتم، دیوان زادہ، ص ۱۴۱

(۲) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی (ذکر میر) مترجم نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۹

(۳) जदुनाथ सरकार मुगल साम्राज्य का पतन, द्वितीय खण्ड, पृ० 3

(۴) ایضاً ص ۲۱

عالمگیر ثانی کا انجام بے حد دردناک ہوا عمادالملک نے اس کو ایک پیر سے ملانے کے بہانے لے جا کر قتل کرا دیا۔ میر تقی میر نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''جب کوٹلے میں پہنچے تو اس بے گناہ کے چاقو مار کر ہلاک کر دیا اور لاش دیوار کے نیچے پھینک دی، شام کے بعد وہاں سے پلٹ کر خان خاناں کے گلے میں پھندا ڈالا، جبکہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیا بادشاہ کی لاش تمام دن کسمپرسی کی حالت میں زمین پر پڑی رہی جو دیکھتا وہ اس وحشیانہ فعل پر لعنت کرتا تھا۔ آخر کار اس کے وارثوں نے دل کڑا کر کے اس کی میت راتوں رات دفنا دی۔ ان مظلوموں نے خوف سے ماتم بھی نہیں کیا''(۱)

اس طرح اٹھارہویں صدی میں مغل بادشاہوں کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ مرنے کے بعد بھی ان کا احترام نہیں تھا۔ جیسا کہ عالمگیر ثانی کی لاش تمام دن دریا کے کنارے جوں کی توں پڑی رہی لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اس بارے میں سودا کا کہنا ہے۔

یوں چاہیے انہیں ہے جنہیں عزم سلطنت
یاز یر پا سر یر ہے یا سر علم کے ساتھ (۲)

شاہ عالم ثانی (۳)-(۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء):

عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد ۳۰ رنومبر ۱۷۵۹ میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔ جس وقت یہ تخت نشیں ہوا اس وقت سلطنت کا شیرازہ تقریباً بکھر چکا تھا خزانہ خالی تھا۔ اسکے علاوہ تربیت یافتہ فوج کی کمی تھی۔ قید میں اتنے سال رہنے کی وجہ سے اسے سلطنت سے متعلق کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اسکو مسائل کا

(۱) میر تقی میر، میر کی آپ بیتی (ذکر میر) مترجم نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۸ تا ۱۱۹

(۲) محمد رفیع سودا، جلد اول، ص ۱۴۳

(۳) عالمگیر ثانی کا بیٹا تھا اس کو ۱۶ راگست ۱۷۵۴ء کو عالی گوہر کا اور ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم ثانی کا خطاب دیا گیا۔ اپنے والد کی وفات کے وقت تیس سال کا تھا۔ وہ ۲۵ سال کی عمر تک وہ اپنے والد کے ساتھ قید میں رہا۔

سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن جب اس کے کردار پر نظر ثانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہمعصر شہزادوں میں نہایت ہی قابل شہزادہ تھا۔ وہ نہ صرف اردو، عربی، فارسی بلکہ سنسکرت، پنجابی اور دیگر زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ شاہ عالم حکمراں کی حیثیت سے جیسا بھی رہا ہو چاہے سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم رہ گئی ہو۔ مگر فارسی، اردو بھاشا، پنجابی زبانوں کو طبع آزمائی کر کے انہوں نے ہندوستان کے ایک طبقے میں اپنی یادگار قائم کر دی۔ شاہ عالم کا مجموعہ کلام ''نادرات شاہی (۱)'' جو اسی بات کا ثبوت ہے اسکو موسیقی میں دل چسپی تھی۔ دراصل موسیقی سے دل چسپی شاہ عالم کے خاندان میں آبائی تھی۔ اس کے عہد میں یہ مشغلہ ایک اور حیثیت سے معاشرے پر اثر انداز ہوا۔ صوفیوں کے ایک گروہ نے ایک خاص انداز سے موسیقی کو اپنی محفل سماع میں جگہ دی'' قوالی کا اتنا دلدادہ تھا کہ شاہی آداب کے خلاف وہ خواجہ میر درد کے تکیہ میں جا کر قوالی کی محفل میں شریک ہوا کرتا تھا۔'' (۲) جادو ناتھ نے لکھا ہے فرنچ کپتان جین لا ۱۷۵۸ سے ۱۷۶۱ تک اس کے ساتھ رہا اس نے شہزادے کا کردار اس طرح پیش کیا ہے'' شہزادہ ان میں سے ایک معلوم ہوتا ہے جس کو اعلیٰ تعلیم ملی ہو اور جنہوں نے اس تعلیم سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہو اس تعلیم میں مذہب، بھاشا اور تاریخ کا علم تھا۔ درحقیقت جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس کے حق میں ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی زبانوں سے بخوبی واقف تھا اس کا کوئی دن ایسا نہیں نکلتا جب وہ کچھ گھنٹوں تک نہ پڑھتا ہو'' (۳) اس طرح اسکے پیش نظر کہا جا سکتا ہے اگر حالات اس کے موافق ہوتے تو شاید وہ سلطنت کو زوال پذیر ہونے سے بچا پاتا لیکن اس وقت سیاسی حالات حد سے زیادہ پیچیدہ تھے۔ سلطنت سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی اقتصادی بدحالی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

---

(۱) اس میں اس وقت کے تمدنی مزاج کو شاہ عالم ثانی نے قلمبند کیا ہے اس کے علاوہ اس میں مختلف تہواروں، متعدد رسموں، آتش بازیوں اور اس وقت کے باجوں کا ذکر ملتا ہے۔

(۲) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد ص ۲۵۴

(۳) जदुनाथ सरकार मुगल साम्राज्य का पतन, द्वितीय खण्ड, पृ० 333

میر تقی میر نے شاہ عالم کی مفلس حالت کو اس طرح نمایاں کیا ہے:۔

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم
ہو گدا جیسے شاہ عالم تم (۱)

شاہ عالم جس کی حالت ابتر ناک تو پہلے سے تھی لیکن مرہٹوں کے عروج کے بعد وہ ان کا محتاج بن کر رہ گیا۔ مادھوراؤ سندھیا جو مرہٹوں کا رہنما تھا اس نے نظام الدین نامی شخص کو بادشاہ کا نگراں مقرر کیا اس نے شاہ عالم کے اخراجات محدود کر دیے تھے وہ بادشاہ کو روزانہ دو سیر چاول اور آٹھ سیر گوشت دیتا تھا مصالحہ کی ذمہ داری بادشاہ پر عائد تھی۔ اس کھانے کی مقدار میں پانچ آدمی بہ مشکل کھا سکتے تھے۔ اسی طرح ملکہ، شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی کھانے کا راشن دیا جاتا تھا۔ بادشاہ کے دسترخوان پر جو روزانہ کھاتے تھے ان میں اس کا معالج خاص، ولی عہد اور اس کی چھوٹی لڑکی ہوتی تھی۔ اس طرح اقتصادی بدحالی کی وجہ سے بادشاہ کا رہا سہا تقدس بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ شاہ عالم بے بسی اور لاچاری کی مکمل تصویر تھا۔ اس کے عہد میں یہ روایت ہوگئی کہ جس کسی بھی امیر کا اقتدار ہوتا وہ اپنی من مانی کرتا حالانکہ یہ بات کوئی نئی نہیں تھی۔ اس طرح بادشاہ محض کٹھ پتلی کی طرح ان امرا کے ہاتھوں میں ناچتا۔ اس کے عہد میں سلطنت دلی سے پالم تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ شمالی ہندوستان کے حکمراں اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کوئی بھی اس کی مدد کے لیے تیار نہ تھا۔ اس طرح غلام قادر روہیلا کا تعاقب کرنے کے لیے اسے سندھیا کی مدد لینی پڑی۔ اس واقعہ کے بعد بادشاہ کی عزت اور ناموس سب ختم ہوگئی۔ ۱۸۰۶ء تک اپنی ناکام زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔ اس بے بسی کے عالم میں اسے ایک اور انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان ہوئی جنگ کے بعد وہ مرہٹوں کی گرفت سے نکل کر انگریزوں کے زیر اثر ہوگیا۔ اگرچہ تیس سال تک پورے ملک میں اسی کے نام کا سکہ (۲) چلتا رہا تاہم اب یہ بادشاہت برائے نام رہ گئی۔ شاہ عالم اول سے شاہ عالم ثانی تک کے مغل بادشاہوں کے عہد پر مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۹۶۱

(۲) حامی دین محمد باشد از فضل الٰہ   بادشاہ ہفت کشور شاہ عالم بادشاہ

بادشاہوں کے دورِ حکومت میں انتظام سلطنت کا انحصار کسی نہ کسی امیر یا پھر کم اہل افراد پر منحصر تھا۔ جیسے جہاندار شاہ کے عہد میں امور سلطنت کا دارومدار لعل کنور اور اس کے رشتہ داروں پر تھا۔ اس طرح جہاندار شاہ نے علی الاعلان عیاشی شروع کی اس کے بعد جتنے بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے انھوں نے اس کی روش پر عمل کیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلا، احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی نے اس سلسلہ کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ مغلیہ سلطنت میں ذرا بھی جان باقی رہی۔ ان بادشاہوں میں سلطنت کے متعلق یا تو کوئی تجربہ نہیں تھا یا پھر دلچسپی کی کمی تھی۔ یہ بادشاہ عیاشی اور نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے میں ایسے مستغرق ہو گئے تھے کہ انھیں امور ملکی سے کوئی سروکار نہیں رہا جس کی وجہ سے امراء کی سازشیں بڑھ گئیں۔ انتشار اور بدحالی میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اکثر بادشاہوں کا حشر دردناک ہوا۔ میر تقی میر نے مندرجہ ذیل شعر میں ان کے دردناک انجام کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے:

ہمارے دیکھتے زیرِ نگیں تھا ملک سب جن کے
کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا (۱)

اس کے پیشِ نظر جب ہم ابتدائی مغل بادشاہوں کے کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بادشاہ امراء کے زیر اثر نہیں تھے۔ ان بادشاہوں نے امراء کے مختلف طبقات کے درمیان توازن بنائے رکھا تھا لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں بادشاہ اپنے امراء پر منحصر تھے۔ ان کے امور سلطنت میں دھیان نہ دینے کی وجہ سے سلطنت کا ہر ایک شعبہ متاثر ہوا۔

جس کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت بے حد خراب ہوئی۔ نہ صرف عوام کی اقتصادی حالت خراب تھی بلکہ مغل بادشاہوں کی بھی اقتصادی حالت اتنی نازک شکل اختیار کر گئی۔ دلی کی طوائف الملوکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میر تقی میر نے کہا ہے کہ:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا (۲)

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۲۴۳
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۳۴

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں بادشاہت ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور صرف نام کی بادشاہت رہ گئی تھی۔

اٹھارہویں صدی میں مغل امراء:

مغل سلطنت میں نظام بادشاہت کا اہم ترین ستون امراء کا طبقہ تھا۔ شاہان مغلیہ نے امراء کی جو تنظیم قائم کی تھی وہ انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ انتظامی معاملات کی صحیح طور پر انجام دہی، سماجی اقدار کی استواری، مغل سلطنت کی فوجی اور سیاسی ذمہ داریوں کا سرانجام اور درحقیقت مغل سلطنت کے استحکام اور تنظیم کا دارومدار امراء کی تنظیم کی کارکردگی پر ہی منحصر تھا۔ امراء کی ترقی کا انحصار بادشاہ پر تھا۔ امراء اور بادشاہ دونوں کے مفادات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ امراء سیاسی نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے تھے۔ وہ اس وقت تک بادشاہ کے وفادار رہتے جب تک کہ وہ طاقتور ہوں۔ اس طرح جب تک مغل بادشاہ سیاسی طور پر طاقتور رہے انھوں نے حکومت کے اداروں پر گرفت مضبوط رکھی اور ان امراء کو اپنے ماتحت رکھا۔ لیکن جب مغل بادشاہ سیاسی طور پر کمزور ہوئے تو ان ہی امراء نے بادشاہ کو محض کٹھ پتلی بنا کر اقتدار خود حاصل کرلیا۔ مغل عہد کے ابتداء میں امراء کی تشکیل ہمیشہ ایران، وسط ایشیا اور دوسرے مسلم ممالک سے ہوتی تھی۔ اکبر نے غیر ملکی امراء کے طبقہ کے طاقت کے پیش نظر راجپوت حکمراں طبقے کو بھی مغل امراء میں شامل کیا جس کی وجہ سے مغل سلطنت کو ہندوستان کے ان قدیم امراء کی بھی حمایت حاصل ہوگئی جن کا ہندوستان میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اورنگ زیب نے جب دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو ان ریاستوں کے امرا اور مرہٹے بھی اس طبقے میں شامل ہوئے۔

مغل امراء کا طبقہ مختلف پیشوں کے افراد پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ان میں اکثر کا تعلق فوجی سپہ سالاروں، جنرلوں اور منتظمین پر ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں شاعر، ادیب،

موسیقار، مصور، نقاش، کاتب، حکیم، علماء، معمار بھی شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان میں جب تک مغلوں کا سیاسی استحکام رہا امراء یہاں جنگوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو بڑھاتے اور مستحکم کرتے رہے۔ ستیش چندر کا کہنا ہے کہ ''سولھویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں امراء کی تنظیم نے مغل سلطنت کے قیام، توسیع اور استحکام کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس تنظیم کی کامیاب کارکردگی کی راہ میں بہت سی اقتصادی اور تنظیمی رکاوٹیں رونما ہوئیں'' (۱) یہی امراء دراصل مغل سلطنت کے عروج و زوال کا سبب بنے۔ مغل امراء جو سولھویں اور سترہویں صدی کے آغاز تک شاہی خاندان کی وفاداری میں متحد تھے وہ اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد میں مذہب، نسل اور عقائد کے اعتبار سے ٹکرے ٹکرے ہونا شروع ہو گئے لیکن درحقیقت امراء کی تقسیم مذہب اور نسل سے زیادہ ان کے ذاتی مفادات پر تھی۔ ''اورنگ زیب کے دور کے آخر اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں مغل دربار میں امراء کی دو جماعتوں نے ممتاز حیثیت اختیار کی۔ ان جماعتوں نے آئندہ چالیس برس تک مغل دربار میں ایک اہم کردار ادا کیا'' (۲) اس طرح محمد عمر کا کہنا ہے ''اورنگ زیب کی وفات کے بعد دربار میں دو حصے بن گئے تھے۔ ایرانی (شیعہ) اور تورانی (سنی) انھوں نے سیاسی حالات کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اور اس دور کی تاریخ دراصل ان ہی فرقوں کی کشمکش کی داستان ہے حتیٰ کہ بادشاہوں کی قسمت بھی انھیں امراء سے وابستہ ہو کر رہ گئی'' (۳)

اسی طرح اٹھارویں صدی کے آغاز میں یہ امراء مغل سلطنت کو طاقتور بنانے کے بجائے اپنی طاقت کو بڑھانے میں اور الگ الگ ریاستیں قائم کرنے میں مشغول رہے۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک تو امراء مغل بادشاہوں کے ماتحت رہے لیکن اورنگ زیب کے بعد امراء نے آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر لی۔ اس طرح اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کی

(۱) ستیش چندرا، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، مترجم محمد قاسم صدیقی، دہلی ۱۹۸۷ء، ص ۱۰
(۲) ایضاً، ص ۲۰
(۳) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۱۴

کمزوری کا فائدہ اٹھا کر یہ امراء خود مختار ہو گئے اور یہاں تک کہ بادشاہ بنانے کا اختیار ان امراء کے ہاتھوں میں آ گیا۔ یہ ہمیشہ اس شہزادے کو بادشاہ بناتے جو سیاسی اعتبار سے نااھل ہوتا۔ اس عہد میں مغل دربار میں امراء کا کردار اور عمل قومی یا سیاسی گروہ بندی پر مبنی تھا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت کے آخر میں دربار میں جو گروہ بندیاں وجود میں آئیں وہ یا تو قبیلہ اور خاندان یا پھر شخصی مفادات پر مبنی تھیں۔ خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ

> ''اٹھارویں صدی میں ان امراء نے جو حالات پیدا کر دیے تھے وہ حد درجہ افسوسناک تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ ایک طرف گروہ بندی کرتے تھے تو دوسری طرف بیرونی طاقتوں سے ساز باز، اس طرح سماج اور سیاست کا ہر گوشہ ان کی شاطرانہ چالوں سے متاثر ہوتا تھا۔ جماعت بندی کے مسموم اثرات محلات سے لے کر جھونپڑیوں تک پہنچے تھے اور سماجی زندگی کی تلخیوں میں سیاست ان ہی دو پارٹیوں کے گرد گھوم رہی تھی'' (۱)

اسی طرح میر تقی میر کا کہنا ہے:

فرو آتا نہیں سرناز سے اب کے امیروں کا
اگرچہ آسماں تک شور جاوے ہم فقیروں کا (۲)

میر تقی میر کے مندرجہ بالا شعر سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اٹھارویں صدی میں امراء سلطنت کے تئیں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے تھے۔ اس طرح وہ امراء جو مغل سلطنت کو مستحکم و مضبوط بنانے میں معاون و مددگار ہو کر دکھاتے تھے وہی سلطنت کی تخریب کے ذرائع ثابت ہوئے۔

اورنگ زیب کے عہد آخر میں امراء کی گروہ بندی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس وقت امرا کے دو اہم گروہ تھے ایرانی اور تورانی۔ اس طرح ایرانی گروہ کے

(۱) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، مئی ۱۹۵۳ء، ص ۳۱۱ تا ۳۱۲
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء، ص ۲۴۳

رہنما اسد خاں (۱) اور اس کا بیٹا ذوالفقار خاں (۲) تھے۔ داؤد خاں، دلپت راؤ، بندیلہ اور رام سنگھ ہاڈا ان کے حامیوں میں سے تھے۔

تورانی گروہ میں غازی الدین فیروز جنگ اور اس کا بیٹا چن قلیچ خاں، حامد خاں اور محمد امین خاں شامل تھے۔ ان دونوں گروہ میں (ایرانی اور تورانی) (۳) میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ تھا اس طرح یہ گروہ دکن میں آزاد ریاست قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ستیش چندر کا کہنا ہے کہ ''ان دونوں گروہوں کے درمیان شروع سے ہی شاہی مراتب کے لیے رسہ کشی تھی۔ خاص طور سے دونوں نوجوان ذولفقار خاں اور قلیچ خاں میں ذاتی عداوت تھی اور ایک دوسرے سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس طرح کی عداوت کوئی عجوبہ نہیں، مغل دربار میں چوتھائی صدی تک شاہی طاقت کے حصول کے لیے ان دونوں گروہ میں سخت کشمکش اور زور آوری رہی اور

(۱) اسد خاں کے والد جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اسد خاں کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ اس کی والدہ شاہجہاں کے وزیر صادق خاں کی بیٹی تھی۔

(۲) ۱۶۷۷ء میں اورنگ زیب کے ماموں امیر الامراء شائستہ خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگئی اور اعتقاد خاں کا خطاب ملا اور ۱۷۰۲ء میں میر بخشی بنا۔

(۳) ایرانی اور تورانی گروہوں کو منصب دیے گئے تھے وہ اس طرح ہیں:

ایرانی گروہ :

اسد خاں	7,000 / 7,000
ذوالفقار خاں	6,000 / 6,000
داؤد خاں	6,000 / 6,000
دلپت بندیلہ	3,000 / 3,000
رام سنگھ ہاڈا	2,500 / 2,000
	24,000 / 24,000

تورانی گروہ :

غازی الدین فیروز جنگ	7,000 / 7,000
چن قلیچ خاں	7,000 / 7,000
محمد امین خاں	4,000 / 1,500
حامد خاں	2,500 / 1,500
رحیم الدین خاں	1,500 / 600
	22,000 / 17,600

اس طرح اس زمانہ کی سیاست اور دوسرے حالات پر ان کا گہرا اثر پڑا'' (۱)۔

اس طرح ہر جماعت (گروہ) اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور اپنی مخالف جماعت کو نقصان پہچانے کے لیے برابر سازشیں کرتی رہتیں۔ اسی سازشی ماحول کا یہ نتیجہ نکلا کہ امرائے سلطنت دشمنوں اور باغیوں کے خلاف کسی مہم پر جانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے مخالفین انکا قلع قمع نہ کردیں۔

اسی وجہ سے یہ امراء اپنی جاگیروں پر بھی نہیں جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ اپنے مفاد کو مغل سلطنت کے مفاد سے زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ اس طرح ان ہی امراء نے اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے جاٹوں، سکھوں اور مرہٹوں یہاں تک کہ انگریزوں کا ساتھ مغل سلطنت کے خلاف دیا۔ اس عہد میں امراء نے اپنا اقتدار جمانے کے لیے براہ راست بادشاہوں کو قتل کرانا شروع کردیا۔ اس طرح اس ضمن میں ظلم اور بربریت کی جو مثالیں قائم ہوئیں، ان کا سلسلہ سید برادران سے لے کر غلام قادر روہیلہ کے مظالم تک پھیلا ہوا ہے۔

امراء کا طبقہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے خودغرض بن گیا تھا جس کی اہم وجہ دولت و اقتدار کی جدوجہد، معاشی پسماندگی، انحطاط اور ثقافتی جمود تھا۔ وہ نہ صرف عیاش اور بدکردار تھے بلکہ بزدل بھی تھے۔ جنگوں میں اہل خاندان کو ساتھ لے کر جاتے تھے، جیسا کہ حاتم نے مندرجہ ذیل اشعار میں امراء کے گرتے ہوئے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ نہ تو ان کو خدا کا ڈر تھا اور نہ ہی پیروں کا:

عجب احوال دیکھا اس زمانے کے امیروں کا
نہ ان کو ڈر خدا کا اور نہ ان کو خوف پیروں کا (۲)

---

(۱) ستیش چندر، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، ص ۲۶ تا ۲۷

(۲) ظہورالدین حاتم، دیوان زادہ، ص ۱۱۹

میر تقی میر کے مطابق:

نہ مل میرؔ اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم(۱)

اس طرح میر تقی میر نے امراء کی کارکردگی پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے اس عہد کے امراء کا منفی کردار نمایاں ہو جاتا ہے۔ امراء کی یہ جماعتیں عہدوں، جاگیروں اور مال و دولت میں ایسی محو ہوئیں کہ انھیں مغل خاندان کی وفاداری کا خیال تک نہ رہا۔ مثال کے طور پر سعادت الملک نے اس وجہ سے کہ اسے امیر الامراء کا عہدہ نہیں ملا تھا اس نے نادر شاہ درانی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دہلی پر قبضہ کر کے وہاں لوٹ مار کرے۔

نظام الملک آصف جاہ نے خود کو دکن میں مستحکم کرنے کی خاطر مرہٹوں کو اکسایا کہ وہ شمالی ہندوستان میں لوٹ مار کریں۔ ان حالات کے پیش نظر بادشاہ کا کوئی وقار نہیں رہا اور وہ بار بار امراء کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا۔ اس طرح ان امراء نے اقتدار کی ہوس میں سلطنت کو سازشوں اور خانہ جنگوں میں ملوث کر کے انتشار کی ان طاقتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جو اب تک سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد میں امراء کا مقصد صرف دولت کے لیے جدو جہد کرنا تھا۔ دراصل اس کے پیچھے اس وقت کے سیاسی حالات کا دخل تھا۔ اس طرح یہ امراء ہر ناجائز طریقے سے دولت کے حصول کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ رشوت لے کر کام کرنا ان کے لیے عام بات تھی۔ ان امراء کی آمدنی کا ذریعہ زمینوں سے حاصل کیا ہوا لگان ہوتا تھا جو کہ بہت کم رہ گیا تھا۔ اس طرح ان کی نظریں خالصہ کی زمین اور شاہی خزانے پر تھیں۔ جعفر علی حسرت نے مندرجہ ذیل اشعار میں امراء کی ناکارکردگی کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

جواہر اور خزانہ تو سب اپنا لیکر
رہیں سوکس پہ یہ فرقہ کے لوگ اور بیگار

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۲۸۹

رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر
جو چھت تھی چاندی کی دیوان خاص کے اندر
سو وہ وزیر نے خرچ بھیج کر ٹکسال (۱)

اس طرح ان امراء کا نجی معیار اس حد تک گر گیا تھا کہ وہ امراء جو بادشاہ کے بے حد قریب تھے رشوت لے کر لوگوں کی سفارش بادشاہ سے کرتے تھے۔

خافی خاں کا کہنا ہے کہ ''قلعہ داروں کا تقرر ہمیشہ بادشاہ کی مرضی سے ہوتا تھا مگر امیر الامراء نے قلعہ داروں کا تقرر خود ہی کرنا شروع کر دیا اور اپنے آدمیوں کو مقرر کر دیا کرتے تھے'' (۲)۔

امراء کی زیادہ تر یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنا تحفظ برقرار رکھیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے تحفظ کو برقرار رکھنے کی خاطر ملک کے تئیں اپنے فرائض سے کوتاہی کی۔

محمد رفیع سودا نے امراء سلطنت کی کارکردگی کے بارے میں مندرجہ ذیل اشعار میں لکھا ہے:

جو مصلحت کے لیے جمع ہوں صغیر و کبیر
تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہونچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر
کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص کے بیچ وزیر
کہ شامیانہ بانسونیہ نقرئی ہیں خول (۳)

اس قسم کے امراء کا واحد مشغلہ لذت کوشی وغیرہ جیسے برے اعمال میں دلچسپی لینا تھا۔ اخلاقی بے راہ روی اس وقت کے امراء کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں عیش پرستی امراء کے کردار کا ایک اہم حصہ بن گئی تھی۔ میر تقی میر نے اس دور کے امراء کو 'قصہ' کوتاہ

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶، ص ۵۶
(۲) خافی خاں، منتخب اللباب، حصہ چہارم، ص ۲۲۲
(۳) محمد رفیع سودا، جلد اول، ص ۳۶۸

رئیس" ہے عیاش کہہ کران کے کردار کی صحیح نشاندہی کی ہے۔ میر نے مندرجہ ذیل اشعار میں اپنے عہد کے امیروں کی عیاشی اور اعمال خبیثہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس
پالیں ہیں رنڈیوں کے اس کے پاس
ہے ناز و شراب سے بے وسواس
رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس
قصۂ کوتاہ رئیس ہے عیاش (۱)

اس طبقے نے مغل بادشاہوں کی طرح سے عیش کوشی میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ دولت کے حصول کی فکر میں سرگرداں رہنے کے باوجود امراء فضول خرچی کے مواقع آسانی کے ساتھ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ یہ بے صلاحیت امیر عہدوں کی تقسیم میں اہلیت اور صلاحیت کے بجائے ذاتی اغراض و مقاصد اور اپنی انا کی غلط تسکین پر زور دیتے تھے۔

اس ذہنی رجحان اور اس غلط منصوبہ بندی سے پیدا شدہ خرابیوں کے خلاف میر تقی میر نے مندرجہ ذیل اشعار میں ناگواری کا اظہار کیا ہے:

چار لچے ہیں مستعد کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوٹ سے ہے کچھ گرمی، بازار
سو بھی قند سیاہ ہے یاماش (۲)

شاہ ولی اللہ نے اس عہد کے امراء کو اپنے فرائض سے غافل ہوتے اور ان کے گرتے ہوئے کردار کو دیکھتے ہوئے امراء سے فرمایا:

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۹۵۲
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۹۵۳

"اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تا کہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی"(۱)۔

یہ طبقہ فیاضی اور عیاشی کے مشاغل میں بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔ امراء خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس عہد میں مغل بادشاہت کے کمزور ہونے کے بعد ان کے جرائم کی سزا دینے والی کوئی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس طرح امراء اپنے علاقوں اور جاگیروں میں خودمختار ہو کر اپنی من مانی کرتے تھے۔ سزائیں دینا، زمینوں پر قبضہ کرنا اور دیگر مختلف طریقوں سے رعیت پر استحصال کرتے تھے۔ میر تقی میر کے مطابق امراء:

کیا اہل دول سے ہے اے میر مجھے نسبت
ہاں عجز و فقیری ہے واں ناز امیری ہے(۲)

اس طرح اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد میں ان امراء نے مغل بادشاہوں کو پوری طرح سے اپنے ماتحت کرلیا۔ اس طبقے میں کرپشن حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا، مالی امور میں ان کا عمل دخل تھا، وہ جو چاہتے تھے وہی کرتے تھے، ان کی نظر میں مغل بادشاہوں کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اس طرح مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے امراء سیاسی اور سماجی اثرات کے تحت متضاد اوصاف کے حامل تھے وہ ہر حالت میں اپنے شخصیت کی اہمیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اپنے فرائض سے غافل، اپنے عہدے اور اقتدار بڑھانے کے لیے سلطنت کی سیاست میں دخل انداز ہونے لگے، ان میں خود فریبی کا رجحان عام تھا۔

☆☆☆

---

(۱) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۳
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۴۳۹

باب سوم

معاشی حالات

باب سوم

معاشی حالات

مغل عہد میں معیشت کی بنیاد زراعت تھی، مالگذاری ہی حکومت کی معیشت کا اہم حصہ تھا۔ جہانگیر کے عہد سے ہی اس نظام میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں خالصہ زمینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ خالصہ زمینوں کی آمدنی مکمل طور پر مرکزی حکومت کے انتظام وانصرام میں لائی جاتی تھی۔ لیکن جب خالصہ زمینوں میں سے بھی جاگیریں تفویض ہونے لگیں تو اس کا اثر مرکزی معیشت پر خاص طور سے شاہی خزانے پر پڑا۔ آہستہ آہستہ بادشاہ، منصب دار اور جاگیردار معاشی بحران کے شکار ہوتے گئے۔

معاشی بحران جو سترہویں صدی کے آواخر میں شروع ہوا تھا۔ وہ اورنگ زیب کے عہد آخر میں نازک شکل اختیار کر گیا اور اٹھارہویں صدی میں ایک شدید مسئلہ بن گیا۔ دراصل یہی بحران اٹھارہویں صدی میں مغل سلطنت کے زوال کا اہم سبب بنا۔ اس معاشی بحران کی اہم وجہ جاگیروں کی تعداد میں کمی ہونا تھا۔ اس طرح جہاں ایک طرف جاگیروں کی کمی تھی تو دوسری طرف جاگیرداروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، اس سے جاگیرداری نظام کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ''اجارہ داری'' نظام کو بڑھاوا ملا۔ اس طرح اورنگ زیب کے عہد آخر تک جاگیرداری نظام تقریباً ناکام ثابت ہوا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ جاگیرداروں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور اسی تناسب سے جاگیریں کم ہونا شروع ہو گئیں اسی وجہ سے جاگیروں کی خاطر منصب داروں کے تقاضے اور دباؤ کو نمٹانے کے لئے خالصہ زمینیں تفویض کی جانے لگیں۔

نادرشاہ درانی کے حملے (۱۷۳۹ء) کے بعد سے تو جاگیرداروں پر سے شاہی دبدبہ ختم ہونے لگا۔ جاگیرداروں نے اپنے اپنے علاقوں کی زائد آمدنی کو شاہی خزانے میں جمع کرانے کے بجائے اپنے استعمال میں لانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں کے تبادلے کے اصول نے جاگیرداروں کو حریص بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں کو اس بات کا بھروسہ نہیں رہا کہ ان کی جاگیران کے پاس رہے گی بھی یا نہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی جاگیروں میں زراعت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ جس کی وجہ سے زراعت پچھڑ کر رہ گئی۔ اس طرح اس بحران کی وجہ سے معاشی حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

خلیق احمد نظامی نے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو علاقہ شاہان مغلیہ کے قبضے میں تھا۔ وہاں جاگیرداری اور اجارہ داری کی رسمیں جاری تھیں اور ان کے مذموم اثرات کاشت کار سے لے کر حکومت وقت تک کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بڑے جاگیردار ایک طرف حکومت کو ٹیکس ادا کرنے سے گیریز کرتے تھے۔ دوسری طرف غریب کاشتکاروں کا خون چوستے تھے۔ ان کا وجود حکومت کے لیے پریشان کن اور کاشت کاروں کے لیے ایک بلائے آسمانی کی مانند تھا۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کی حالت مختلف تھی انہیں کوئی لگان دینے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت نے اپنا کام آسان کرنے کے لیے سارا ملک جاگیرداروں میں بانٹ رکھا تھا۔ جو علاقہ رہ گیا تھا وہاں اجارہ داری کی رسم جاری کر دی تھی۔ ان حالات میں ہر طبقہ پریشان اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا (۱)۔"

اس عہد کی معاشی حالت کے بارے میں ستیش چندر کا کہنا ہے کہ "اس زمانے میں پیداوار پہلے کی بہ نسبت کم ہو گئی۔ بہادر شاہ کے

---

(۱) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، مئی ۱۹۵۳ء، ص ۳۱۲

دور حکومت میں جاگیرداری کی رسم کا خطرہ اور بھی بڑھ گیا۔ چھوٹے منصب داروں کی حالت خراب ہوگئی۔ کیونکہ جاگیریں ملنے پر بھی ان کی آمدنی بہت کم ہوتی تھی۔ بہادر شاہ نے امیروں کو بڑے بڑے منصب اور ترقی دے کر حالات کو اور بھی پیچیدہ بنادیا۔ خالصہ زمین کو جاگیروں میں تبدیل کرنے کے رجحان کی ابتداء اسی وقت سے ہوتی ہے۔ جہاندار شاہ کے زمانے میں حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ خالصہ زمین بھی اجارے پر دی جانے لگی۔ جس سے کسانوں کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ حکومت آمدنی کم ہوگئی، خانہ جنگی نے مالی مشکلات کو اور بھی برھادیا (۱)''

اس کے علاوہ بہادر شاہ کی حد سے زیادہ فیاضی اور جہاندار شاہ کی عیش و عشرت کا اثر ملک کی معاشی حالت پر پڑا۔ اس طرح محمد شاہ کے عہد میں معاشی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہوگئی۔ نادر شاہ درّانی کے حملے کی وجہ سے معاشی حالت اور بھی نازک شکل اختیار کرگئی۔ اس عہد کی اقتصادی بدحالی کے پیچھے جو اسباب پوشیدہ تھے، شاہ ولی اللہ نے ان اسباب کا تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وغالب سبب خراب البلدان فی هذا الزمان شیئان احد هما تصنیفهم علی بیت المال ان یعتادو التکسب بالاخذ منه علی انهم من الغزاة او من العلماء الذین لهم حق فیه. او من الذین جرت عادة الملوک یصلتهم کالذهادو الشعراء او د بوجه من وجوه التکری ویکون العمدة عندهم هو التکسب دون القیام بالمصلحة فیدخل قوم علی فینغضون علیهم ویصیرون کلا علی المدینة والثانی ضرب الضرائب الثقیلة علی الزراع والتجار والمتحرفة والتشدید علیهم حتی یفضی الی الاحجان المطاوعین واستیصالهم والی تمتع اولی باس شدید وبغیهم وانما تصلح المدینة بالجبایة الیسیرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة فیلقبه اهل الزمان لهذه النکتة.

(۱) ستیش چندر، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، مترجم محمد قاسم صدیقی، دہلی، ۱۹۸۷، ص ۲۴۷ تا ۲۴۸

اس زمانے میں ملک کی خرابی وویرانی کے زیادہ تر دوسبب ہیں۔ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانہ پر تنگی،وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑگئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعوی سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا علم ہیں جن کا حق اس خزانہ کی آمدنی میں ہے یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام واکرام دیا کرتے ہیں،جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر۔اور دوسرے گروہوں میں جو ملک وسلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی طریقے سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کردیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔

دوسرا سبب کاشتکاروں،بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے۔یہاں تک کہ جو بچارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں،وہ تباہ ہورہے ہیں اور جو سرکش وارنادہندہ ہیں وہ اور سرکش ہورہے ہیں اور حکومت کو محصول نہیں ادا کرتے۔حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدیداروں کے بقدر ضرورت پر تقرر پر ہے چاہے کہ اس زمانے کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں''(۱)

اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشی حالات کی بنیاد زراعت پر تھی اور اسی پر ملک کی معاشی زندگی کا دارومدار تھا۔لیکن زراعت میں بدحالی کے باعث کسان نوکریوں کی تلاش میں شہر جانے لگے۔جس کی وجہ سے زراعت پچھڑ گئی اور اس کا ملک کی اقتصادی حالت پر گہرا اثر پڑا۔احمد شاہ کے عہد میں تو شاہی خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔لگان وصول کرنے کے سبھی ذرائع ختم ہو چکے تھے۔سلطنت بھاری قرضے سے دب گئی تھی۔اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ

(۱) شاہ ولی اللہ،شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات،مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی،دہلی،۱۹۶۹،ص ۳۵۔۳۶

سے سپاہیوں اور دیگر ملازمین کو عرصے تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ جس کی وجہ سے احمد شاہ بادشاہ کے آخر چھ ماہ کے عرصے میں لگاتار بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہت کے کمزور ہونے کے سبب کوئی بھی بادشاہ کو قرض دینے کو تیار نہیں تھا۔

شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ "نوکران بادشاہ جو کہ ایک لاکھ سے زائد تھے، ان میں پیادہ و سوار بھی تھے، اہل نقدی و جاگیردار بھی تھے، بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر عمل دخل نہیں پاتے، کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے، جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا، نقدی بھی موقوف ہوگئی، آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسہ گدائی اپنے ہاتھ میں میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمین بادشاہ کا یہ برا حال ہے تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں، انہیں پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک خراب ہوگیا ہوگا، طرح طرح کے ظلم اور بے روزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں (۱)"

مغل بادشاہوں کے معاشی حالات: شعراء کی نظر میں

مغل بادشاہوں کی معاشی حالت اس دوران کتنی بدحال تھی۔ اس کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ تاریخی ماخذ کے علاوہ اردو شاعری میں مغل بادشاہوں کی بدحال معاشی حالت کا تذکرہ ملتا ہے۔ میر تقی میر، سودا، مصحفی، جعفر علی حسرت وغیرہ اس دور کے تقریباً ہر ایک شاعر نے بادشاہ کی معاشی حالت کو نمایاں کیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں میر تقی میر نے بادشاہ کی اقتصادی حالت کو ان الفاظ میں اس طرح نمایاں کیا ہے:

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری
اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری (۲)

---

(۱) شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۶۹، ص ۸۹۔۹۰

(۲) میر تقی میر: کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۱، ص ۹۵۷

میر تقی میر کے اس شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس عہد میں اقتصادی حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ بادشاہ تک پر ایک چھوٹی سی رقم بھی بار تھی۔ شہزادوں اور شہزادیوں کی حالت غرباء سے بھی بدتر تھی۔ اسپیر (Spear) کا کہنا ہے کہ ''ان شہزادوں کو مر جانے دیا جاتا تھا لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت محض اس وجہ سے نہ دی جاتی تھی کہ یہ کام ان کے شایان شان نہ تھا۔ ان کے حالات جانوروں سے بھی بدتر تھے'' (۱)

اسی طرح شہزادہ عالی گوہر (۲) کا دیوان شاکر علی بیان کرتا ہے، ایک بار اس نے شوربے کا ایک گھڑا شہزادے کو جانچ کے لئے بھجوایا تو اس نے کہا کہ یہ محل کی عورتوں کو دے دو کیونکہ محل میں تین دن سے چولہا نہیں جلا تھا'' (۳)

مصحفی نے شاہی گھرانے کی خستہ حالی کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

احوال سلاطیں کی لکھوں کیا میں خرابی
یعنی کہ مہ عید اب ان کو لب ناں ہے

فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر
جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے۔ (۴)

مصحفی کی طرح سے میر تقی میر نے بھی مندرجہ ذیل اشعار میں بادشاہ کی اقتصادی بدحالی کی طرف اشارہ کیا ہے:

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی
جود کو چاہئے زمانا بھی

---

(۱) Percival Spear : Twilight of the Mughals, Delhi, Rprint, 1969, P. 62-63

(۲) تخت نشین ہونے کے بعد شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا۔

(۳) जदुनाथ सरकार : मुगल साम्राज्य का पतन, द्वितीय खण्ड, अनुवादक मथुरालाल शर्मा, आगरा, 1972, पृ: 22

(۴) غلام ہمدانی مصحفی: دیوان مصحفی، مرتبہ و منتخبہ، اسیر لکھنوی و امیر مینائی، پٹنہ، ۱۹۹۰، ص ۳۶

یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی
کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال(۱)

مغل بادشاہوں کی عیش پرستی کی وجہ سے بھی اقتصادی حالات اور بھی زیادہ خراب ہوگئے۔غربت،افلاس،بےکاری اور مالی وسائل کی کمی جیسے اسباب نے مغل شہزادوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔اخراجات کی تنگی کے باعث مغل شہزادے آپس میں لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔یہ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مہاجنوں سے قرض لیتے تھے۔عموماً یہ قرض کو ادا بھی نہیں کر پاتے تھے''جب ان کے پاس پیسے ختم ہوجاتے تھے تو یہ اپنے گھروں میں شور مچاتے تھے۔بادشاہ کی رہائش ان سے دور نہیں تھی ان کا ایک ایک لفظ سنتا''(۲)

محمد رفیع سودا نے ان حالات کو اس طرح سے واضح کیا ہے:

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی دراپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائیے ہیگی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجئے گھول(۳)

جعفر علی حسرت کے مطابق

رہے بچارے سلاطین کا حال سو کیا
کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال(۴)

---

(۱)میر تقی میر:کلیات میر،ص ۹۵۸
(۲)مبارک علی،مغلیہ سلطنت کا آخری دور،لاہور،۱۹۹۳،ص ۴۱ بحوالہ''شاہ عالم ثانی اور اس کے عہد کا دلی دربار،ص:۱۳۸ تا ۱۳۹۔
(۳)محمد رفیع سودا،کلیات سودا،جلد اوّل،مرتبہ عبدالباری آسی،لکھنؤ ۱۹۲۳ء ص ۳۶۹
(۴)جعفر علی حسرت،کلیات حسرت،مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،لکھنؤ،۱۹۶۶،ص ۵۷

احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں منصب داروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے نوکروں تک کی تنخواہ تین سال سے چڑھی ہوئی تھیں، بھوکھوں مرتے سواروں نے اپنے گھوڑے بیچ ڈالے تھے۔ پیدل فوج کے بدن پر کپڑے تک نہیں ہوتے تھے، شاہی جانوروں کو چارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ جب بادشاہ کی سواری باہر جاتی تو اس کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا "کبھی کبھی تو شاہی نوبت اور نشان بھی ساتھ نہیں ہوتا'' جعفر علی حسرت نے ان واقعات کو مندرجہ ذیل اشعار میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وہ شہ سپہر کے انجم نمط سی جس کی سپاہ
سواس کی ڈیوڑھی پہ کئی پیادے ہیں بحال تباہ
سو مارے فاقوں کے مرتے ہیں چٹھاتے تنخواہ
کہیں ہیں ہم کو ملے کیا خوراک خاص کو آہ

سحر کو تب ہو جو بھیجے کڑوریا کتوال(۱)

اس طرح اقتصادی بدحالی کے باعث بادشاہ کی بیگمات اور شہزادوں کو محل کا سازو سامان بیچ کر گذارا کرنا پڑ رہا تھا مصحفی نے ان حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

گل جائے زباں میری کروں، ہجو گران کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطین کی بیاں ہے(۲)

جادو ناتھ سرکار نے شاکر خاں کے حوالے سے لکھا ہے "احمد شاہ کے گدی پر بیٹھنے کے کچھ وقت بعد ہی اس حد تک حالات ابتر ہو گئے کہ شاہی دربار میں جو چیزیں تھیں ان کی فہرست بنائی گئی۔ یہ چیزیں دکانداروں کو بیچی گئی اور اس طرح جو روپیہ ملا اس سے فوج کی تنخواہ چکائی گئی یہ چیزیں تھیں قالین، کھانا بنانے کے برتن، تھالیاں، کتابیں، بینڈ باجوں کا سامان اور دیگر سب کارخانوں کی چیزیں''(۳)

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ ۱۹۶۶، ص ۵۶
(۲) غلام ہمدانی مصحفی، دیوان مصحفی، ص ۳۶
(۳) जदुनाथ सरकार: मुगल साम्राज्य का पतन प्रथम खण्ड, पृ. 188

''سلاطین کی رہائش گاہیں اونچی دیواروں میں گھری ہوئی ہیں کہ کوئی ان کے اندر نہ دیکھ سکے ان کے درمیان لاتعداد جھونپڑیاں ہیں۔جن میں یہ ذلت کے مارے لوگ رہتے ہیں۔جب کبھی قلعہ کا دروازہ کھلتا ہے۔تو ان غریب مفلس،نیم برہنہ ونیم بھوکے لوگوں کا ہلہ ہوتا ہے اور ہمارے اردگرد کھڑے ہوجاتے ہیں۔ان میں کچھ کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ تجاوز کرگئی ہے۔یہ بچپن ہی سے یہاں قید رہے۔ان میں سے کچھ تو جوان ہیں اور کچھ بادشاہ کے بچے ہیں۔جن کی مائیں یا تو مرگئی ہیں یا پھر ٹھکرادی گئیں۔(۱)(انگریزی سے ترجمہ)

اس طرح شاہی خاندان کے وہ لوگ جو رشتہ در رشتہ دور دراز پیڑھی پہ پہنچ کر منسلک تھے وہ بھی روٹی تک کے محتاج تھے۔راسخ کے مطابق۔

بیان کیا ہو، بے مہریٔ آسماں
ہیں اہل زمین اس کے ہاتھوں بہ جاں
کیا اس کی گردش نے عالم تباہ
کیا تاج شاہی کو کشکول آہ
شہوں کو بھی اس نے گدا کردیا
غم فقر میں مبتلا کردیا (۲)

امراء کی معاشی حالت:

بادشاہ کی طرح سے امراء کی بھی معاشی حالت بدحال تھی۔جاگیرداری بحران کے باعث امراء کی معاشی حالت بے حد اثر انداز ہوئی۔کیونکہ ان کی اقتصادی حالت کا انحصار جاگیروں سے ہونے والی آمدنی پر تھا۔لیکن جب جاگیروں سے آمدنی ہونا بند ہوگئی تو ان کو اقتصادی طور پر بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔محمد رفیع سودا نے اس پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

---

(۱) Percival Spear . Twilight of the Mughals, Delhi, Reprint 1969, P . 62

(۲) راسخ کا شہر آشوب،مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد،دہلی،۱۹۶۸ء،ص:۱۵۵

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند(۱)

اس عہد میں جاگیروں پر مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے قبضہ کرلیا تھا، جس کی وجہ سے امراء کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہوگیا۔ امراء کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے ہر فرد کو مفلسی کی زندگی گذارنی پڑرہی تھی۔

اس طرح امراء کی جاگیریں اس دوران بے اثر و بے وقر ہوگئیں تھیں۔ ان سے لگان وصول کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا۔ جن مسائل کا سامنا اس دوران امراء کو کرنا پڑرہا تھا۔ اس پہلو کے بارے میں سودا کا کہنا ہے کہ:

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو ہمیں دیکے ہوں انہو نسے حریف

نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف۔(۲)

اس طرح سودا کے مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ امراء جن کا کبھی اقتدار تھا۔ لیکن اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔ فصلیں بھی تباہ و برباد ہورہی تھیں۔ ربیع اور خریف کی فصلیں جن سے کبھی نفع ہوتا تھا۔ لیکن ان فصلوں سے اب کچھ حاصل نہیں ہورہا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں کچھ ہی امراء کو چھوڑ کر باقی سبھی امراء کی حالت بے حد خستہ تھی۔ زیادہ تر امراء قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ مورخین کے علاوہ امراء کی شدید بگڑی اقتصادی حالت کا ذکر شعراء نے بھی کیا ہے۔ حاتم نے امراء کی معاشی پس ماندگی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

جہاں میں صاحب خس خانہ گھاس والے ہیں
جنہوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لائے ہیں(۳)

---

(۱) محمد رفیع سودا: کلیات سودا، جلد اوّل، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲، ص: ۳۶۷
(۲) محمد رفیع سودا: کلیات سودا، جلد اوّل ص: ۳۶۷
(۳) ظہورالدین حاتم: دیوان زادہ، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵، ص: ۱۹۲

جعفرزٹلی نے بھی ہم عصر امراء کی اقتصادی حالت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

امراؤ سب ہیں بیخبر احدی بچارے بیو قر
اسوار پاجی سے بتر یہ نوکری کا حظ ہے
نوکرفدائی خان کے محتاج آدھی نان کے
تعبین بے ایمان کے یہ نوکری کا حظ ہے(۱)

سترہویں صدی کے آخر میں ہوئے اقتصادی بحران کا سب سے زیادہ اثر نچلے درجے کے امراء پر پڑا۔ لیکن اونچے طبقے کے امراء بھی اس بحران سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔ تقریباً سبھی شعراء نے امراء کے اقتصادی زوال کے بارے میں اشعار قلم بند کئے ہیں۔ امراء اور بادشاہ کی اقتصادی زبوں حالی کے باعث یہی شعراء جن کی سرپرستی مغل امراء اور بادشاہ کرتے تھے۔ اس وقت دہلی سے ہجرت کرر ہے تھے عموماً شعراء اقتصادی بدحالی کے ذمہ دار غیر ملکی حملہ وروں کو مانتے تھے۔ اقتصادی بدحالی اور معاشی پریشانیوں نے امراء کی حالت پر گہرا اثر ڈالا۔ نادرشاہ درانی (۱۷۳۹) کے حملے کے بعد تو امراء کی حالت پہلے سے بھی زیادہ پس ماندہ ہوگئی۔ نادرشاہ کے حملے کے وقت درگاہ قلی خان دہلی میں تھے۔ انہوں نے اس پہلو کے بارے میں مندرجہ ذیل اشعار میں لکھا ہے کہ:

غنی فقیر سبھی مبتلا بہ رنج برنج
دھیان، ہوش نہیں ہے کسی میں سب مضطر
نکل گیا ہے رئیسوں کا بھی پلیتھن اب
تلاشِ دال اڑاتے ہیں دوڑتے گھر گھر(۲)

معاشی بحران کے باعث ان امراء کو بے حد محنت و مشقت کرنی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ مرکز کے کمزور ہونے سے معاشی حالات خراب ہوگئے۔ جس سے اس کا اثر سلطنت کے ہر ایک شعبہ پر

(۱) میر جعفر زٹلی: کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹، ص: ۱۴۳ تا ۱۴۴

(۲) درگاہ قلی خاں کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ص ۵۰

پڑا۔ محمد رفیع سودا نے امراء کی معاشی حالت کے زوال پذیر ہونے کا تذکرہ ان اشعار میں کیا ہے:

بس ان کا ملک میں کارنسق جویوں ہوتباہ
کہ کوہ، زرہوزراعت میں تو، نہ دیں پرکاہ
جگہ وہ کونسی نوکررکھیں یہ جسبپہ سپاہ
کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ

کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھکے غول(۱)

اس طرح اٹھارہویں صدی کے تقریباً ہر ایک شاعر نے امراء کی معاشی بدحالی کو نمایاں کیا ہے اور اس کے علاوہ امراء کی فوجی طاقت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ امراء کی فوجی طاقت اس حد تک کمزور ہوگئی تھی کہ وہ غیر ملکی حملے آوروں تک کا مقابلہ نہیں کرسکے۔ یہاں تک کہ امراء کو دیگر طاقتوں یعنی جاٹوں، مرہٹوں وغیرہ جیسی طاقتوں سے مدد لینی پڑی۔ جعفر علی حسرت نے امراء کی معاشی حالت کو مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

امیروں کے تئیں یہ سعی اور تلاش رہے
کہ گونہ پالکی ہویانہ دورباش رہے
کسی طرح سے بنے تو یہ نان وآش رہے
نہ گوقناعت ہوپرداحرم کا فاش رہے

دوان خانے میں ہو پیک دان اور رومال
طلب جودیں تو کہامانیں ان کا سب انفار
سناویں گالیاں پردے کنے پکار پکار
نہ عربی باجاہے نہ تاشاپالکی میں سوار
سواکہاروں کے کوئی نہیں ہے عہدہ دار
اٹھادے ہے کوئی شمشیر اور کوئی ڈھال(۲)

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل، ص ۳۶۷
(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶، ص ۵۷

جعفر علی حسرت نے جس طرح سے امراء کی معاشی بدحالی کو بیان کیا ہے۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں امراء کی حالت معاشی طور پر اتنی بدحال تھی کہ نہ تو ان کو سواری کے لیے پالکی میسر تھی اور نہ ہی دورباش تھا۔ایک وہ زمانہ تھا جب امراء طبقے کی سواری شاہانہ انداز سے نکلتی تھی۔

سوؔدا نے منصور علی خاں نامی ایک منصب دار کا ذکر کیا ہے۔جس کا سات ہزار کا منصب تھا۔وہ بھی اس وقت اقتصادی بدحالی کے ہاتھوں مجبور تھا۔اس پہلو پر سوؔدا کا کہنا ہے کہ

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے

ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال
چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے(۱)

جن امراء کے پاس آمدنی کے کچھ ذرائع باقی رہ گئے تھے،ان کے لیے بھی شان وشوکت کی زندگی گزارنا تو کیا اپنے نوکروں کی تنخواہ ادا کرنا ممکن نہیں تھا۔چنانچہ حاتؔم نے امراء کی معاشی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

جن کے ہاتھی تھے سواری کو،سواب ننگے پاؤں
پھرتے ہیں جوتے کو محتاج،پڑے سرگرداں

نعمتیں جن کو میسر تھیں،ہمیشہ بروقت
روز پھرتے یہاں،قوت کو اپنے حیراں

جن کے پوشاک سے معمور تھے توشہ خانے
سووہ پیوند کو پھرتے ہیں،ترستے عریاں

---

(۱) محمد رفیع سوؔدا،کلیات سودا،جلد اوّل ص ۳۶۷

پر چہ نان کو رکھ ہاتھ میں، کھاتے ہیں امیر
جس کو دیکھوں ہوں سو ہے، فکر میں غلطاں پیچاں

خوان الوان کہاں، اور وہ دسترخواں
یعنی چہ میر و چہ مرزا و چہ نواب و چہ خاں(۱)

اس طرح بادشاہ و امراء کی معاشی بدحالی کا اثر سماج کے ہر ایک طبقے پر پڑ رہا تھا۔ کیونکہ یہ طبقات اپنی مالی حالت کے لیے حکمراں طبقے پر منحصر تھے۔ ان کے ذریعے بنائے گئے سامان کی مانگ حکمراں طبقے میں کم یا نہ ہونے کی وجہ سے صنعت و حرفت کو بے حد نقصان پہنچا۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمراں طبقے سے لے کر نچلے طبقے تک معاشی تنگی اور افلاس کا شکار تھے۔ اس طرح ہر ایک طبقے کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بے روزگاری کی وجہ سے ہر طبقے کی حالت خراب تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے بے روزگاری کی وجہ سے مختلف طبقات کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مندرجہ ذیل اشعار میں تذکرہ کیا ہے:

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند(۲)

جعفر علی حسرت کے مطابق:

جو گھر میں بیٹھے ہیں مفلس غریب بے نوکر
انہوں کا حال تو کیا کہیے کیسے ہیں مضطر

---

(۱) حاتم کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۷۵ تا ۷۶
(۲) نظیر اکبرآباری، کلیات نظیر اکبرآبادی، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، 1951، ص ۴۶۵

سوائے دانۂ اشک اور انہیں نہ آئے نظر
اٹھیں ہیں گھر سے وہ منہ کو چھپانے کے شب کو اگر
پڑے ہے ٹکڑا کوئی منہ میں جب کریں وہ سوال (۱)

اسی وجہ سے صناع جو بادشاہ اور امراء کی مفلسی کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ تباہ حال ہو گئے تھے۔ میر تقی میر نے اس کا ذکر مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے:

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے (۲)

شاہ ولی اللہ نے بھی گرتی ہوئی مالی حالت کے بارے میں اپنی فکر کا اظہار کیا ہے اور اس کی اصلاح کے بارے میں لکھا ہے "خالصہ کا بڑا علاقہ بڑھایا جائے تاکہ بادشاہ کو صوبے داروں اور جاگیرداروں کی اقتصادی غلامی سے نجات ملے۔ جاگیریں عطا کرنے میں احتیاط اور دور بینی سے کام لیا جائے" (۳) اس طرح کسی بھی حکومت کی ترقی کا انحصار اچھی مالی حالت پر ہوتا ہے۔ جس ملک کی معاشی حالت اچھی ہوگی وہاں ہر ایک شعبہ میں ترقی ہوگی۔ معاشی پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "جس سوسائٹی میں معاشی توازن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی مذہب اچھا اثر ڈال سکتا ہے" (۴)

اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں سماج کے مختلف طبقات ایسے دور سے گزر رہے تھے جہاں پر اقتصادی توازن بالکل نہیں تھا۔ جہاں ایک طرف

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۸
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۱، ص ۱۶۷
(۳) شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۹، ص ۴۹
(۴) ـــــــ ایضاً ص ۳۳

خالصہ زمینیں محدود تھیں تو دوسری طرف جاگیرداروں کی تعداد زیادہ تھی۔اس کے علاوہ اجارہ داری کے مسموم اثرات۔اس طرح اقتصادی توازن نہ ہونے کی وجہ سے حکمراں طبقے کے ساتھ ساتھ سماج کے دیگر طبقات پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا۔مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں سماج کا ہر طبقہ جیسے سپاہی، عالم، فاضل، شاعر، طبیب، سوداگر، کسان، وکیل، مشائخ غرض کہ ہر ایک طبقہ مفلسی و بدحالی کا شکار تھا کیونکہ ان طبقات کی اقتصادی زندگی کا دارومدار ایک دوسرے پر تھا۔

سماج کے مختلف طبقات کی معاشی حالت: شعراء کی زبانی

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مختلف طبقات اقتصادی طور پر جن مسائل سے گزر رہے تھے اس کا تذکرہ تاریخی مآخذ کے علاوہ اردو شاعری میں بھی ملتا ہے۔جعفر زٹلی، شاکر ناجی، میر تقی میر، قائم چاندپوری اور راسخ نے سماج کے ہر ایک طبقے کی اقتصادی پسماندگی کا ذکر شاعری میں کیا ہے۔اس طرح ان شعراء کی شاعری کی روشنی میں اس عہد کی اقتصادی حالت کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کچھ شعراء نے بزاز، بساطی، بقال، بھڑبھونجے، دھنیے، عطارہ، قصاب، کبابی، نانبائی وغیرہ کے کام نہ چلنے کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لوگوں میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی بھی استطاعت تک نہیں تھی۔

سپاہیوں کی معاشی حالت:

فوجی نظام جو مغل سلطنت کا اہم ترین ستون تھا۔جس پر سلطنت کا دارومدار قائم تھا۔لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اقتصادی بدحالی کے باعث بے حد کمزور ہو گیا تھا۔کیونکہ مغل سلطنت کی اقتصادی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے سپاہیوں کو وقت پر تنخواہ کبھی نہیں ملتی تھی۔اورنگ زیب کی دکنی پالیسی کے باعث خزانہ کافی حد تک خالی ہو گیا تھا اور جو تھوڑا بہت خزانہ باقی بچا تھا وہ اورنگ زیب کے جانشینوں نے عیش وعشرت میں خالی کر دیا تھا۔اس طرح وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ان کے بیوی بچوں کو فاقے کرنے تک کی

نوبت آجاتی تھی۔اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے فوجیوں کو شدید ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ان میں بیزاری،خواری اور ذلت کا زبردست احساس پیدا ہو گیا تھا۔جعفر زٹلی نے فوجیوں کی حالت کو اپنی شاعری میں جس طرح سے نمایاں کیا ہے اس سے ان کی زار حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔انہوں نے فوجیوں اور فوجی جانوروں کی خستہ حالی،نوکری ڈھونڈے نہ ملنا،اور نوکری مل بھی جائے تو تنخواہ نہ وصول ہونا وغیرہ تاریخی حقائق کو مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

مردم پریشاں یکدیگر گشتہ سپاہی دربدر
خوردہ بسے خونِ جگر یہ نوکری کا خط ہے

شش ماہہ حق مرداں،برگردن دولتوراں
تس پر سواری ناگہاں، یہ نوکری کا خط ہے

بس خستہ وبیحال ہے،ٹوٹی پرانی ڈھال ہے
جامہ مشبک جال ہے،یہ نوکری کا خط ہے

گھوڑا رہا بھوکا سدا اور فاقہ شد میاں گد
یہی کہے میرا خدا،یہ نوکری کا خط ہے

جب دوڑ کوں سب اوٹھ چلے اسوار بیٹھے یوں کلے
ٹٹو بچارا نا ملے،یہ نوکری کا خط ہے(۱)

’’سپاہیوں کو چھتیس چھتیس مہینے تک تنخواہ ادا نہ ہوتی تھی،دانہ دانہ کو محتاج رہتے تھے،جنس اسلحہ وآلات حرب بنیئے کے ہاں گروی رکھ کر اشیائے خوردنی حاصل کرتے تھے اور اگر اتفاق سے کچھ سامان مل جاتا تو کھانا نصیب ہوتا۔ورنہ ان کے لیے سال کے بارہ مہینے رمضان سے کم نہ ہوتے تھے اور جس دن کچھ کھانے کو مل جاتا تو ان کی نظر میں وہ عید سے کم نہ ہوتا‘‘(۲)۔

---

(۱)میر جعفر زٹلی،کلیات میر جعفر زٹلی،مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد،علی گڑھ،۱۹۷۹،ص۱۴۳تا۱۴۴

(۲)محمد عمر،اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد،دہلی،۱۹۷۳،ص۱۶۰تا۱۶۱

محمد رفیع سودا نے اس پہلو کی عکاسی مندرجہ ذیل اشعار میں کی ہے:

گھوڑا لے اگر، نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر، عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف ودانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں ہے تو سپر بنیے کے یاں ہے
ثابت ہو جود گلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہے پیرگیری، تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے، فاقہ سے میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید، دگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضان ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کا پھر پیٹنا اس شکل سے یاں ہے(۱)

اس طرح زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑ رہا تھا۔ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے فوج میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ فوج کی کارکردگی بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ فوج اس قابل نہ رہی تھی کہ ملک کے سرکش عناصر کا استحصال کر سکے۔ اس عہد میں اقتصادی حالات اس حد تک نازک ہو گئے تھے کہ ان سپاہیوں نے اقتصادی بدحالی سے تنگ آ کر اپنے گھوڑے تک بیچ دیے تھے۔ جانوروں کے کھانے تک کا چارہ مہیا نہ تھا جس کی وجہ سے وہ بھوک سے مر رہے تھے یہاں تک کہ سپاہیوں کو بنیوں سے قرض لے کر گزر بسر کرنا پڑ رہا تھا۔ جعفر زٹلی کا کہنا ہے:

سپاہی حق نہیں پاویں نت اوٹھکر چوکیاں جاویں
قرض بنیوں سے لے کھاویں عجب یہ دور آیا ہے(۲)

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲، ص ۳۶۳
(۲) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹، ص ۱۴۶

قائم چاندپوری کے مطابق:

فوج کی ہے اشک حالت تباہ
آہ سے اس وقت مدد چاہیے(۱)

فوج میں اعلیٰ درجے سے لے کر نچلے درجے تک کے فوجیوں کی حالت افلاس زدہ تھی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان فوجیوں کے بدن پر وردیاں بھی نہیں تھیں جس کا ذکر میر تقی میر نے ان اشعار میں کیا ہے:

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس
بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس
چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں ننگے سپاہ(۲)

معاشی پسماندگی کے باعث فوج میں لڑنے تک کی طاقت نہیں رہی تھی۔ محمد شاکر ناجی جو احمد شاہ کی فوج میں بحیثیت ایک سپاہی تھے۔ انہوں نے فوجیوں کی خستہ حالی کو مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔ یہ اشعار انہوں نے ۱۷۵۴ء میں لکھے تھے ناجی کے مطابق فوجیوں کی حالت:

لڑے ہوئے نہ برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے وائی ددوں کی جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

---

(۱) قائم چاندپوری، دیوان، قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳، ص ۱۴۳
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۸۰۶

گلے میں ہنسلیاں، بازو اوپر طلائی نال
قضا سے بچ گیا، مرنا نہیں تو ٹھانا تھا

کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا

ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ ودوکان نہ غلہ وبقال(۱)

شاکرناجی کے یہ اشعار چشم دید گواہ کی شہادت ہیں۔ شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رہی سہی فوج بھی بے بس ولاچار ہوگئی۔ مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے ولولے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ احمد شاہ کے زمانے میں محلات شاہی کے سازوسامان کی فہرست بنا کر دکاندار کو دے دی گئی تا کہ اشیاء کو بیچ کر یا گروی رکھ کر سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کردی جائیں۔ سپاہیوں کی اقتصادی حالت کے بارے میں جعفر علی حسرت کا کہنا ہے:

سپاہی جو رہے بیچارے ان کے یہ اوقات
کہ بیچ کرکڑی تختے وہ کھاتے ہیں دن رات
ہے چھٹی چوب کی مینڈھے پہ ان کی بھس پہ برات
سنیں ہیں کوچ کے دن وہ سئیس کی سوبات
کہ اس کے ہاتھ میں ہے بڑا ابغل میں پال(۲)

سپاہیوں کی تنگدستی کے بارے میں میر تقی میر کا کہنا ہے کہ:

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال(۳)

---

(۱) محمد شاکرناجی کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۴۷ تا ۴۸
(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۷
(۳) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۹۵۲

نظیر اکبرآبادی کے مطابق:۔

ایسا سپاہ مرد کا دشمن زمانہ ہے
روٹی سوار کو ہے نہ گھوڑے کو دانا ہے
تنخواہ نہ طلب ہے نہ پینا نہ کھانا ہے
پیادے دوال بند کا پھر کیا ٹھکانا ہے
در در خراب پھرنے لگے جب نقار بند(۱)

اس طرح اٹھارہویں صدی کے تقریباً ہر ایک شاعر نے فوجیوں کی اقتصادی بدحالی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

سوداگروں یا تجارتی طبقے کی معاشی حالت:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں سولہویں اور سترہویں صدی میں تجارت عروج پر تھی۔تجارت کو فروغ دینے میں سوداگروں اور حکومت کا اہم کردار ہوتا تھا۔لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں سیاسی حالت کے ابتر ہو جانے سے اس کا اثر تجارت پر بھی پڑا، راستے محفوظ نہیں رہے تھے۔جس کی وجہ سے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک سوداگروں اور کاریگروں کی آمدورفت تقریبا بند ہوگئی۔اس طرح راستوں کے محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے سوداگر ایک مقام سے دوسرے مقام پر آسانی سے نہیں جاسکتے تھے۔اور اسی وجہ سے اس عہد میں سوداگروں کو نقصانات اٹھانے پڑے۔اس کے علاوہ اس عہد میں مغل بادشاہوں نے تجارت میں ترقی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔کیونکہ سوداگروں کی اقتصادی زندگی کا انحصار مغل بادشاہوں اور امراء پر تھا۔سوداگر وہ بیش قیمت اشیاء مغل بادشاہوں اور امراء کو فروخت کرکے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرتے تھے۔لیکن جب حکمراں طبقے کی حالت خراب ہوگئی تو اس کا اثر سوداگروں کی معاشی زندگی پر بھی پڑا۔اس طرح ان کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔جن مسائل کا سامنا ان کو کرنا پڑرہا تھا

---

(۱) نظیر اکبرآبادی، کلیات نظیر اکبرآبادی، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۵۱، ص ۴۷۰

اس کا تذکرہ مندرجہ ذیل اشعار میں محمد رفیع سودا نے اسطرح کیا ہے:

سوداگری کیجئے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہان ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل
ہر شام یہ دل وسوسہ سود وزیان ہے
لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس میں
یہ درد جو سینے تو عجب طرفہ بیان ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ وزدیکا گمان ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق
پھر پیسوں کی جاگیری کی عامل پہ نشان ہے
پروانہ لکھا کرگئے عامل کنے جس وقت
کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لیجا
دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے
جو پالکی نکلے ہے تو فریاد وفغان ہے(۱)

اس طرح حکمران طبقے کی اقتصادی بدحالی کا اثر سوداگروں پر براہ راست پڑ رہا تھا۔ سیاسی انتشار ہونے کے باعث سوداگر شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں میں اشیاء کو بیچنے میں قاصر تھے۔ کیونکہ اشیاء کو فروخت کرنے کے لئے بازار مہیا نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے یہ سوداگر سامان اٹھائے لمبے فاصلے تک جاتے تھے۔ اس طرح ان کو بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی سبب ان کی مالی حالت بے حد ابتر ناک ہوگئی۔

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل ص ۳۶۴ تا ۳۶۵

سوداگروں کے علاوہ بقال، سیٹھ، ساہوکار، وغیرہ کو بھی منافع کے بجائے تجارت میں نقصان ہورہا تھا۔ سیاسی انتشار کا اثر تجارت پر پڑنے کی وجہ سے یہ پیشہ زوال پذیر ہونے لگا۔ بیرونی تجارت کے مراکز بھی تباہ برباد ہوگئے۔ تجارتی شاہراہوں پر لوٹ مار، چنگی کی چوکیوں کی کثرت اور امراء کی مفلسی وہ اسباب تھے، جن سے کہ اندرونی اور بیرونی تجارت بے حد متاثر ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کہ ہندوستان کے بیشتر صنعتی مراکز اسی صدی میں برباد وتاراج کیے گئے۔ نادر شاہ درانی نے دلی لوٹی، ابدالی نے لاہور، دلی اور متھرا کو برباد کیا۔ جاٹوں نے آگرہ کو اور مراہٹوں نے سورت، گجرات اور دکن کو تباہ و برباد کیا اس طرح بیشمار حملوں کی وجہ سے تجارت پر برے اثرات پڑے۔

راسخ نے اس پہلو پر اس طرح عکاسی کی ہے:

تجارت کا مایہ کسو میں کہاں
کہ باقی نہیں کچھ بہ جز نقد جاں

اب افلاس کا گرم بازار ہے
دمِ سرد ہی سے سروکار ہے(۱)

سولہویں اور سترہویں صدی میں تجارت عروج پر تھی۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت حکمران طبقے کی اقتصادی حالت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ مغل بادشاہ تجارت کی ترقی کی طرف ہمیشہ دھیان دیتے تھے۔ اس طرح سوداگر بازار میں عیش وعشرت کا سامان اور دیگر دوسری اشیاء جیسے مختلف نسلوں کے گھوڑے دوسرے ممالک سے لاتے تھے۔ جن کے خریدار امراء یا پھر بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ان سوداگروں کی لائی ہوئی اشیاء کو نہیں خرید پاتے تھے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ اس طرح شمالی ہندوستان میں سخت معاشی وسیاسی ابتری کے باعث ان سوداگروں کو اشیاء کو بیچنے کیلئے کوئی خریدار

(۱) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۱۵۳

نہیں مل رہا تھا۔ جن مسائل سے اس وقت سوداگر گزر رہے تھے۔ اس کا تذکرہ جعفر علی حسرتؔ نے ان اشعار میں کیا ہے:۔

معاش کیا کروں سوداگروں کی تم سے بیاں
گدھے کے مول ہے گھوڑا خرید صدتو ماں
اگرچہ نسل عراقی ہویا ہو از ایراں
یہاں سے پھیر کے لے جائیں زیرے کو کرماں
نہ پاویں پشم کی قیمت اگر ہو کیسی شال(۱)

راسخؔ کا کہنا ہے ؎

ہوا تختہ دوکانِ سوداگری
نہ کوئی فروشندہ نہ مشتری(۲)

''ستیش چندر کے مطابق سوداگر جنہیں سب سے زیادہ استحکام اور پر امن حالات کی ضرورت تھی، وہ خود جاگیردار طبقہ پر اس قدر منحصر تھے، کہ وہ آزادانہ طور پر کوئی کردار ادا کرنے کی جسارت نہیں رکھتے تھے۔ اس سے امراء کا کردار نہایت ہی اہم ہو گیا تھا۔ جب تک امراء حکمران کے ساتھ امن واستحکام قرار رکھنے میں مددگار رہتے اور حکومت کو تجارت، صنعت، وحرفت اور اور کاشتکاری کے فروغ دینے کے نظریے سے چلاتے رہتے تھے'' (۳)

حالانکہ بیلی، مظفر عالم اور چیتن سنگھ نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے کہ سوداگر اب مرکز کو چھوڑ کر علاقائی اور ابھرتی ہوئی ریاستوں میں جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ ان شعراء کا تعلق چونکہ دہلی سے تھا اس لئے ان کی شاعری میں دہلی دربار کی عکاسی زیادہ ہے۔ اس طرح مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے علاقائی ریاستوں میں سوداگروں کی سرپرستی ہو رہی تھی۔

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۹
(۲) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸، ص ۱۵۳
(۳) ستیش چندر، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، ص ۲۶۴

راغبؔ کے مطابق تاجروں کی حالت:

جو تاجر ہیں سو بے بضاعت ہیں سب
گرفتار رنج و مصیبت ہیں سب (۱)

کسانوں کی معاشی حالت:

اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد میں کسانوں کی اقتصادی حالت بے حد خراب تھی جس کا ذکر اس عہد کے شعراء نے بھی کیا ہے۔اورنگ زیب کی وفات کے بعد اجارہ داری نظام (۲) نے کافی حد تک فروغ پالیا تھا۔ٹھیکہ دار اس علاقے سے زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرتے تھے۔اس طرح اس نظام سے کسانوں کی اقتصادی حالت پر برا اثر پڑا۔جس کی وجہ سے کسانوں کی حالت پہلے سے اور بھی زیادہ بدتر ہوگئی۔اب غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر جاگیروں سے فصل تیار ہونے سے پہلے لگان وصول کرنا کسانوں کے لئے تکالیف کا باعث تھا۔جس کی وجہ سے کسان گاؤں کو چھوڑ کر بھاگنے لگے۔جس کا زراعت پر گہرا اثر پڑا۔پیداوار گرنے لگی۔میر تقی میرؔ نے کسانوں کی پس ماندہ حالت کو مندرجہ ذیل شعر میں نمایاں کیا ہے:

فصل ہونے ابھی نہیں پائی
پیشگی سب نے قرض لے کھائی (۳)

اس عہد میں کسانوں کی اقتصادی حالت اتنی بدحال تھی کہ فصل تیار ہونے سے پہلے ہی کسان پیشگی لے کر اس فصل کی متوقع آمدنی سے بھی زیادہ کھا لیتے تھے۔جیسا کہ میر تقی میر نے مندرجہ بالا شعر میں بیان کیا ہے حالانکہ یہ بات کوئی نئی نہ تھی۔مگر اٹھارویں صدی کے حالات کے پیش نظر خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی ''مرقع دہلی'' کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے'' کسانوں سے اتنا لگان وصول کیا جاتا تھا کہ وہ بہ مشکل پیٹ بھر سکتے تھے،امراء و روساء کو تنخواہ کے بجائے اکثر جاگیریں ملتیں،بادشاہوں کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ کوئی علاقہ کسی جاگیردار کے پاس زیادہ

---

(۱) راغب کا شہر آشوب،مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد،دہلی،۱۹۶۸،ص ۱۱۶
(۲) یعنی ٹھیکیداری مختلف علاقوں میں لگان کی وصولیابی کا کام سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو دیا جاتا تھا۔
(۳) میر تقی میر،کلیات میر،ص ۵۸۸

عرصے تک نہ رہے۔ اس لئے وہ علاقے کی فلاح و بہبودی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے"(۱)

اس طرح اس سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جب جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں کسانوں کی حالت اتنی خراب تھی تو اٹھارہویں صدی کے آغاز میں سیاسی پیچیدگیوں کے سبب کسانوں کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ محمد رفیع سودا نے کسانوں کی اقتصادی بدحالی کا تذکرہ مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:۔

دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجئے کھیتی
اور مینھ بھی موافق ہے پڑے تو تو سماں ہے
ہیں خشکی و ترقی کے تفکر میں شب و روز
نہ امن ہے دل تئیں نے جیکو اماں ہے(۲)

سترہویں صدی کے اختتام میں جب جاگیرداری بحران ہوا تو اس کا اثر کسانوں پر بھی پڑا۔ اس بحران کی وجہ سے کسانوں کا استحصال ہونا شروع ہوگیا۔ رقومات جمع میں مصنوعی اضافے کے پیش نظر جاگیردار مجبور تھے کہ اپنی جاگیروں پر جمع کا تخمینہ بڑھا دیں مگر اتنی رقم جاگیردار ادا نہیں کر پاتے تھے۔ جس طرح زمین دار یا تو مالگزاری کی وصولیابی کا ذمہ لینے سے انکار کر دیتے یا پھر اس بوجھ کو کسانوں پر ڈال دیتے تھے۔ اس طرح کسانوں کی حالت دن بدن گرتی چلی گئی۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب کے جانشینوں نے بھی زراعت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ کسانوں کی غربت کا سبب یہ بھی تھا کہ زمین کی افراط ہونے کے باوجود ریاست، جاگیردار، زمین دار اور ٹھیکیدار کسانوں سے زیادہ رقم وصول کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے تو دوسری طرف زرعی ترقی کے لئے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ راغب نے کسانوں کی بدحال اقتصادی زندگی کی اس طرح عکاسی کی ہے:۔

زراعت جنہوں کا سدا کام ہے
انہوں کی بھی صبحِ طرب شام ہے

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتبہ ومترجم ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی، ۱۹۶۳، ص ۱۲
(۲) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، ص ۳۶۵

تہی دست ایسے ہیں وے، اور حزیں
کہ بونے کو دانہ میسر نہیں (۱)

شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ ''زمینداروں، کاشتکاروں، اہل صنعت وحرفت اور تجار پر حکومت نے بڑے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں، پھر طرۃ یہ کہ ان کے وصول کرنے میں ان کے ساتھ تشدد کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وفادار اور مطیع فرماں رعیت ان ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جارہی ہے اور ان کی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات ملک کی بربادی کا باعث ہے'' (۲)

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسانوں کے پاس مالگزاری ادا کرنے کے بعد اپنے لئے بہت کم روپیہ باقی رہ جاتا تھا۔ اس لئے اقتصادی حالت دن بدن گرتی چلی گئی۔ پریشان اور غریب کسانوں نے مجبور ہو کر کبھی کبھی زمینداروں کو مغل سلطنت کے خلاف مدد دینا شروع کردیا۔ راسخ کا کسانوں کی حالت کے بارے میں کہنا ہے:

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے
ذریعہ غایاں تو نایاب ہے

کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال
کہ سرسبز ہونا بہت ہے محال

خطر اس میں خشکی کا ہر آن ہے
اگر ہوئے غرقی تو طوفان ہے (۳)

---

(۱) راغب کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸، ص ۱۱۷
(۲) شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ، حصہ اول، مترجم مولانا عبدالرحیم، لاہور (پاکستان) ۱۹۶۲، ص ۲۸۸
(۳) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸، ص ۱۵۳

شعراء کی معاشی حالت:

اٹھارہویں کے آغاز میں شعراء کی بھی اقتصادی حالت پس ماندہ تھی۔ دوسرے طبقات کی طرح سے شعراء کی اقتصادی زندگی کا انحصار مغل بادشاہوں پر تھا۔ لیکن جب اس عہد میں مغل بادشاہ کی اقتصادی حالت کمزور ہوگئی تو اس کا اثر ان کی اقتصادی حالت پر بھی پڑا۔ اس طرح یہ طبقہ بھی بدامنی کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا اور دلی کو چھوڑ کر علاقائی ریاستوں میں جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ جن اقتصادی پریشانیوں سے اس دور میں شعراء گذر رہے تھے۔ اس عہد کے ہر ایک شاعر نے اپنی آپ بیتی کا تذکرہ کیا ہے۔ سودا نے شعراء کی بدحال اقتصادی حالت کو ان اشعار میں اس طرح نمایاں کیا ہے:

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے

مشتاق ملاقات انہوں کا کس و ناکس
ملنا انہیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھے جاگے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیت خاں زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے تطفۂ خاں ہے

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین (۱) کہاں ہے (۲)

اس عہد میں شاعری ہی شعراء کا ذریعہ معاش تھی۔ اس کے سہارے ان کی گذر بسر

---

(۱) مرثیہ گو شاعر کا نام

(۲) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل، ص ۳۶۵

ہوتی تھی۔اس طرح شاعری ہی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔باکمال شعراء کی تعظیم وتکریم کی جاتی اور روپے پیسے سے ان کی مدد کرنا تہذیبی فرض اور باعث شرف سمجھا جاتا تھا۔لیکن بدلے ہوئے حالات میں انہیں اپنے فن کو معیشت کا براہ راست ذریعہ بنانا پڑا۔ان کی مذلت وخواری کا سودا، راسخ، راغب اور جعفر علی حسرت کی شاعری میں ذکر ملتا ہے۔اس عہد میں مغل بادشاہوں کی اقتصادی حالت خراب ہونے کے باعث وہ اس طبقے کی سرپرستی نہیں کر پا رہے تھے جب مغلیہ سلطنت عروج پر تھی تو اس وقت دیگر فن کاروں کی طرح سے شعراء کو بھی مغل بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے تو شاہی دربار سے کوئی بھی شاعر وابستہ نہیں رہا۔اس طرح امراء ورؤساء نے شعراء کو پناہ دی۔زوال کا ان شعراء کی زندگی پر سیدھا اثر پڑ رہا تھا۔میر تقی میر نے بذات خود اپنی اقتصادی پس ماندگی کا ذکر ''مخمس در شہر کاماحسب حال خود'' میں اس طرح کیا ہے۔

کاما سے تلخ کام اٹھایا ہے مرے تئیں — دلی میں بیدالانا پھیرایا میرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا میرے تئیں — حاصل کہ پیس سرمہ بنایا میرے تئیں
میں مشت خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر لایا پے تلاش — یاں آکے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش — اس واقعہ سے آگے اجل پہونچی ہوتی کاش
ناموس رہتی فقر کی جاتا نہ اعتبار

مدت رہا ساتھ جنھوں کے خراب حال — دانستہ ان تھوں نے کیا مجھ کو پامال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں میں نپٹ ملال — یہ زندگی سہل ہوئی جاں کی وبال
اس جمع میں کسو کو میں پایا نہ دستیار

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا — ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طالب گار واں گیا — چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی　　نالائقوں سے ملتے لیاقت میری گئی
کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی　　ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سبکسارو بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا کے نیم جاں　　پوچھا نہ مجھ کو یک لب ناں سے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں　　آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آکے آشکار

پرواخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے　　عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
رخنے ہمشہ آتے رہے سر پہ تیر سے　　ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار(۱)

اس طرح احمد شاہ بادشاہ کے بعد تو شاہان دلی اس قابل نہیں رہے کہ کسی فن کی سرپرستی کرتے۔ سیاسی کشمکش کی وجہ سے دلی کے اہم ترین شعراء دلی چھوڑ کر لکھنؤ، فیض آباد اور عظیم آباد وغیرہ ریاستوں میں جارہے تھے۔ اس طرح اُن شعراء نے تلاش معاش کی اُمید میں ان ریاستوں کا رخ کیا۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس طبقے کو اقتصادی بدحالی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ راغب، راسخ اور جعفر علی حسرت کے مندرجہ ذیل اشعار میں شعراء کی زبوں حالی کا ذکر ملتا ہے۔
راغب کا شعراء کی معاشی حالت کے بارے میں کہنا ہے:۔

کہوں آہ کیا شاعروں کی میں بات
گیا چل انھوں کا ہے، پائے ثبات
کریں شعر کی فکر، کیا ذکر ہے
ہمیشہ انہیں پیٹ کی فکر ہے (۲)

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۹۵۰۔۹۵۱

(۲) راغب کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۸

شعراء کی معاشی حالت جعفر علی حسرتؔ کے مطابق:۔

جو شعر کہتے تھے سو فکر قوت میں ہیں اسیر
صلہ تو دیویں نہ سن مدح بادشاہ و وزیر
مگر کہ ہجو کہیں سو رکھیں نہ ننگ امیر
مریں تو مرثیہ کہنے کی رکھتے ہیں تدبیر
کہ نان وحلوا کا آکر انھیں بندھا ہے خیال (۱)

اس طرح مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مغل سلطنت کی سیاسی و اقتصادی طور پر کمزوری کی وجہ سے شعر کی اقتصادی حالت خراب تھی۔ اگر چہ مغل بادشاہوں کو سیاسی ہنگاموں سے فرصت ملتی تو وہ شعر وادب کی تجدید کرتے۔ اس طرح دہلی کی مرکزیت کے کمزور ہونے کا اثر معاشرے کے ہر طبقے پر پڑ رہا تھا۔

مولویوں کی معاشی حالت

مغل سلطنت کے زوال کا اثر مولویوں کی اقتصادی حالت پر بھی پڑ رہا تھا۔ کیونکہ بادشاہ اور امراء کی سرپرستی میں یہ طبقہ خوشحال زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر جب ان کو دی جانے والی مدد معاش جاگیریں بھی کم ہو گئیں اور ان کو ملنے والے وظائف بھی تقریباً ختم ہو گئے تو نتیجے کے طور پر ان کی اقتصادی حالت بے حد خراب ہو گئی۔ بے روزگاری کی وجہ سے انھوں نے دوسرے پیشوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا اور ان پیشوں کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ مولویوں کو جن مسائل کا سامنا اس وقت کرنا پڑ رہا تھا اس کا ذکر محمد رفیع سوداؔ نے اس طرح کیا ہے:۔

ملائی اگر کیجیئے تو ملا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

---

(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۸

اور ماحضرا خوند کا اب کیا میں بتاؤں
یک کاسۂ دال عدس و جو کی دو نان ہے

دن کو تو بچارہ وہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

تسپر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اوسکے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے

اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے (۱)

اس طرح ان کو ذلتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ معاشرے کے دوسرے طبقات پر بھی ان کی اقتصادی زندگی کا دارومدار تھا۔ لیکن زوال کی وجہ سے یہی طبقے بے روزگار ہو گئے جس کی وجہ سے مولویوں کی بھی اقتصادی زندگی متاثر ہوئی۔ اس طرح محنت و مشقت کرنے کے باوجود بھی ان کو مہینے میں صرف دو روپے ملتے تھے جیسا کہ سوداؔ نے کہا ہے۔ سوداؔ کی طرح سے نظیر اکبر آبادی، راغبؔ اور راسخؔ نے بھی ان کی اقتصادی حالت کی اس طرح عکاسی کی ہے۔
نظیر اکبر آبادی کے مطابق مولویوں کی اقتصادی حالت:

بامن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب مدرسوں کے بیچ

نذر و نیاز ہوگئی سب ایک بار بند (۲)

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، ص ۳۶۵ تا ۳۶۶
(۲) نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر اکبر آبادی، مرتبہ عبد الباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ص ۴۶۹

راغبؔ کے مطابق:

معلّم جو قابل بہت آج ہے
نپٹ نوکری کا وہ محتاج ہے

الف با سے بیضاوی تک جو پڑھائے
وہ آٹھ آنے کی نوکری بھی نہ پائے (۱)

راسخؔ کے مطابق:

معلم ہوا ناظم وقت اگر
کوئی پوچھتا ہی نہیں اس کو پر

پڑھاوے دو صد طفل کو وہ مدام
ملے گر اسے ایک رکابی طعام (۲)

اس طرح اس معاشی انحطاط کا اثر مولویوں پر براہ راست پڑ رہا تھا جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار میں سوداؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، راغبؔ اور راسخ نے بیان کیا ہے۔

مشائخ کا حال:

مشائخ کی اقتصادی حالت سماج کے دوسرے طبقات کی طرح سے بدحالی تھی۔ جس کا ذکر اس عہد کے شعراء نے بھی کیا ہے۔ اس طرح ان طبقات کی حالت خستہ ہونے کے باعث مشائخ کی روزی کا ذریعہ جو مختلف طبقات کی اقتصادی حالت پر منحصر تھا ختم ہو کر رہ گیا۔ عوام کی معاشی حالت خراب ہونے کے باعث ان کو نذرانے میں ملنے والی رقم بھی بند ہو گئی تھی۔ اقتصادی بدحالی کے باعث مشائخ کا کردار بالکل گر گیا تھا وہ دینی اعمال کے بجائے دنیاداری میں محو ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے عوام کے لئے مشائخ ایک مثال تھے اور سماج میں ان کو عزت واحترام کی نگاہ

---

(۱) راغب کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸، ص ۱۱۵
(۲) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸، ص ۱۵۲

سے دیکھا جاتا تھا مگر اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے ان کے کردار میں گراوٹ آگئی۔ اُردو شاعری میں جا بجا شعراء نے مشائخ کی حالت پر روشنی ڈالی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار میں راسخ نے لکھا ہے کہ مفلسی کی وجہ سے وہ تلاش معاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ بھوک نے ان کو غم زدہ بنادیا تھا۔

مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں
دل ان کے بھی صدمہ کش بیم ہیں

فسانہ بنا ان کا قال و مقال
رہا کچھ نہ افلاس سے ان میں حال

غم قوت ہے یاں تلک ہر زماں
کہ ہیں رشتہ سبحہ سانا تواں

گئے سارے درود و وظائف کو بھول
کیا ایسا فکر شکم نے ملول

کہ اسم الٰہی سے وے دل دو نیم
زباں پر نہیں رکھتے جز یا حلیم

لبوں پر انھوں کے اگر کیجیے غور
بہ جز نان و حلوا نہیں ذکر اور

وظیفہ ہے ہر آن اب حرف قوت
کیے دانے تسبیح کے صرف قوت (۱)

جعفر علی حسرت کے مطابق مشائخ کا حال:

جنھوں کا پیری مریدی تھا سلسلہ جاری
انھوں کو ملنے لگی گھر میں ناں بدشواری

(۱) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

مرید فاقوں سے مرتے ہیں خود نبا چاری
سنی جہاں کہیں مجلس ہے واں کی تیاری
دو روٹی قلیہ پر جاکر لگے وہ کرنے حال(۱)

سودا کے مطابق مشائخ کا حال:

چاہے جو کوئی شیخ بنے، بہر فراغت
چھٹتے ہی تو شعراء کے وہ مطعون زباں ہے
دیتا ہے دم خر سے کوئی، شملے کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی، کو تشبیہ کناں ہے
اور اس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت
اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اوٹھ کر
ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی
لے خیل مریداں کو گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو وہاں سب کو ہوا وجد
کوئی کودے ہے کوئی رودے کوئی نعرہ زناں ہے
بے تال ہوئے شیخ جو، ٹک وجد میں آکر
سرگوشیوں میں پھر مذ اصولی کا بیاں ہے
گر تال سے پڑتا ہے قدم تو کبھی ہنس ہنس
کہتے ہیں کوئی حال ہے یہ رقص زناں ہے

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۸

اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو
ڈالا ہوا واں دال نخود، قلیہ و ناں ہے

سب پیشہ یہ تج کر، جو کوئی ہو متوکل
جو رو تو یہ سمجھتی ہے نکھٹو یہ میاں ہے (۱)

اطباء کی اقتصادی حالت

دوسرے طبقات کی طرح سے اطباء کی بھی اقتصادی حالت پسماندہ تھی۔ اس طبقے کو بھی بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ یہ طبقہ اپنی مالی حالت کے لیے سماج کے دوسرے طبقات پر منحصر تھا۔ لیکن جب ان طبقات کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی تو اس کا اثر اطباء کی اقتصادی زندگی پر بھی پڑا۔ کیونکہ سماج میں ہر طبقہ اپنی معاشی حالت کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ تھا۔ اس طرح بے روزگاری و اقتصادی پریشانیوں کے باعث جو اپنے فن میں ہر طرح سے ماہر تھے دوسرے پیشوں کو اختیار کر رہے تھے۔ اس پیشے میں کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ اس طرح طبیبوں کو اکثر نوکری ہی نہیں ملتی اور اگر نوکری مل بھی جاتی تو سودا اور راسخ کے بیان کے مطابق ان کو ہزار طرح کی بے عزتی سہنا پڑتی۔ حسرت کے مطابق بے روزگاری کے سبب بہت سے تو مجبوراً طبیب سے کحال بن جاتے تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے اس پہلو کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

وہ جو کہ فن طبابت میں تھے ارسطو رائے
انھوں نے دیکھا غذا ہووے تب دوا کوئی کھائے
مرض ہے جوع بقر کا، سو کس طرح سے جائے
وہ چھوڑ طب کو کہیں جو کچھ اب خدا دکھلائے
سلائی سرمہ لے بازار میں بنے کحال (۲)

(۱) محمد سودا، کلیات سودا، جلد اوّل ص ۳۶۶
(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، لکھنؤ ص ۵۸

راسخ کے مطابق:

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول
اطباء ہیں اس عہد میں سب ملول
نہیں قدر داں کوئی یہ پیچ ہے
اگر بوعلی ہے تو وہ ہیچ ہے
ہر اک کو مرض، مفلسی کا ہے آج
طبیب اب بچارے کریں کیا علاج (١)

مصاحب کی حالت:

مصاحب باوقار پیشہ سمجھا جاتا تھا اور مخصوص صلاحیتوں کے لوگ اسے اختیار کرتے تھے۔ لیکن اب اس پیشے میں کوئی وقعت میں انہیں رہی تھی اور مفلس کی وجہ سے امراء نے مصاحب رکھنا بند کر دیا تھا۔ محمد رفیع سودا راغب اور راسخ نے شاعری میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ راسخ نے مصاحب کی حالت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

مصاحب کوئی اب کسو کا ہو کیا
ندیمی میں بھی اب نہیں کچھ مزا (٢)

وکیلوں کی معاشی حالت:

وکیل (٣) جن کی اقتصادی زندگی کا دارومدار جاگیرداروں اور امراء کی اقتصادی حالت پر منحصر تھا۔ لیکن جب ان کی اقتصادی حالت پسماندہ ہوئی تو اس کا اثر وکیلوں کی مالی حالت پر بھی پڑا۔ جن میں مسائل سے وکیل گذر رہے تھے سودا نے ان کی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

(١) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ١٩٦٨ء، ص ١٥٤
(٢) راسخ کا شہر آشوب، ص ١٥٤
(٣) یہ آج کے دور کے وکیلوں جیسے نہ تھے بلکہ جاگیرداروں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے بڑے جاگیرداروں کے اپنے وکیل ہوا کرتے تھے جو ان کی غیر حاضری میں جاگیروں سے مال گزاری وصول کرتے تھے۔ جاگیرداروں کی نمائندگی کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔

گر خان و خوافین کی لے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے

ہر عمدہ کے دروازے پہ زیں پوش پہ بیٹھا
پوچھے ہے اجی مرد ہے، نواب کہاں ہے

ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں
ہر کوچہ میں جوں آب چکا بودہ رواں ہے (۱)

راسخ کے مطابق:

وکالت کا بازار بھی سرد ہے
وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے

یہ پیشہ تھا آگے بہت خوشنما
وکیلوں کی کیا بندھ رہی تھی ہوا

کہاں اب وکالت ہو رونق پذیر
مؤکل ہی سب گئے ہیں فقیر (۲)

راغب کے مطابق وکیلوں کی معاشی حالت:

وکالت سے جن کو سروکار ہے
انہوں کا بہت گرم بازار ہے

موکل رواں ہیں وکیلوں کے گھر
زمانے کا ہے انقلاب اس قدر (۳)

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل، ص ۳۶۵
(۲) راسخ کا شہر آشوب، ص ۱۵۳
(۳) راغب کا شہر آشوب، ص ۱۱۷

پیشہ وروں کا حال:

دیگر پیشہ وروں کی طرح سے دستکاروں صنعت کاروں سنگ تراش مصور معمار وغیر پیشہ ور طبقات کی حالت مالی طور پر خراب تھی۔ جب مغلیہ سلطنت عروج پر تھی تو شاہی سرپرستی ان طبقات کو ملی ہوئی تھی۔ مغل حکمراں ہمیشہ ان پیشوں کو ترقی دینے میں گامزن رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان پیشوں کی بے حد ترقی ہوئی۔ لیکن معاشی بدحالی میں فنون مفیدہ کی سرپرستی ممکن نہیں رہی تھی تو فنون لطیفہ کو کون پوچھتا۔ اس طرح مصوری، نقاشی، مینا کاری وغیرہ کو ذریعہ معاش بنانے والے فنکار مفلسی کا شکار تھے۔ سودؔا جعفر علی حسرت، نظیر اکبر آبادی، راغب راسخؔ نے شاعری میں ان پیشہ وروں کی اقتصادی بدحالی کو نمایاں کیا ہے۔

جعفر زٹلی نے مندرجہ ذیل اشعار میں جن اقتصادی پریشانیوں سے اس وقت یہ پیشے ور گذر رہے تھے، ان کی حالت کو بیان کیا ہے:

دھنیا جو لاہا طاق ہے کنجڑا قصائی چاق ہے
دیوث قرمسائی ہے یہ نوکری کا خط ہے

ہر صبح ڈھونڈے چاکری نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھونڈں لاگ ری یہ نوکری کا خط ہے (۱)

اس طرح نظیر اکبر آبادیؔ نے بھی چھتیس پیشے والوں کی بے کاری پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ان میں لوہار، سنار، رنگریز، کمان گر، صحاف، تارکش مشروع دارائی، ازار، بننے والے اور کاغذی شامل ہیں۔ ان پیشہ وروں کی حالت کو نظیر اکبر آبادی نے اس طرح نمایاں کیا ہے۔

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ سب یاں کے دست کار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار

---

(۱) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، ص ۱۴۳

کوٹے ہے تن لہار، تو پٹتے ہیں سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا، نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار، بند(۱)

مصوروں کا حال:

مصوروں جتنی ترقی شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی۔ اس کے بعد سے تو ممکن نہ ہو سکی کیونکہ اورنگ زیب کا زیادہ تر وقت دکن کو فتح کرنے میں گذرا۔ جس کی وجہ سے اس فن کی طرف کوئی دھیان نہیں دے سکا۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب مصوری کو شریعت کی رو سے غلط سمجھتا تھا۔ اس طرح جو سرپرستی مصوروں کو جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں ملی ہوئی تھی وہ اورنگ زیب کے عہد میں بالکل ختم ہو گئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس طرح ان کی اقتصادی حالت بے حد خراب تھی۔ جعفر علی حسرت نے مصوروں کی حالت کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

مصور اُن میں جو تھے کھینچتے ہیں حیرانی
ٹکے کو کھینچ دے تصویر، گرچہ، ہو مانی (۲)

اس طرح اس عہد میں پیشہ وروں کی جو خستہ حالت تھی۔ اس کا ذکر تاریخی مآخذ کے علاوہ اردو شاعری میں بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ میر تقی میر نے لکھا ہے کہ "آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری" تو اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مغل بادشاہ جب دانے دانے تک کو محتاج تھے تو وہ کیسے ان فنکاروں کی سرپرستی کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کی اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے مختلف طبقات بھی معاشی طور پر بدحال ہو گئے۔

---

(۱) نظیر اکبرآبادی، کلیات نظیر اکبرآبادی، ص ۴۶۶
(۲) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۹

راغبؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں مختلف پیشہ وروں کا اس طرح نمایاں کیا ہے:

عطار:

نہیں اس کو حاصل جو بازار سے
بتر ہے گا عطّار بیمار سے

نداف و کبابی:

نہ دھنیا ہی سر اپنا دھنتا ہے اب
کبابی کا بھی سینہ بھنتا ہے اب

نانبائی و قصاب:

بہت روتا روٹی کو ہے نانبا
جگر قیمہ قیمہ ہے قصاب کا

رنگریز:

زبس اس کو بیکاری کا درد ہے
بہت چہرہ رنگریز کا زرد ہے

بقال:

کہے ہے یہ بقال میں بیچوں (کیا)
نہیں جو ہے مجھ پاس گندم کی جا (۱)

اس کے علاوہ راغبؔ نے دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا احوال بھی شاعری میں نمایاں کیا ہے۔

شعراء نے ایک حجّام تک کی حالت کو نمایاں کیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا کہنا ہے کہ کام نہ چلنے کی وجہ سے حجّام کے آلات کا کند ہو جانا اور کوئی کا بھولے بھٹکے آنکلنے پر، اس کا سر بنواتے ہوئے

(۱) راغب کا شہرآشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۱۱۴ تا ۱۱۵

جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس کو کپکپی لگ جانا، اس طرح ایسے معنی خیز اشارے ہیں جو تباہ حالی اور فاقہ زدگی کے اس بیان کا ناقابل تردید اور انتہائی موثر ثبوت ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے حجام کی حالت مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

حجام پر بھی یاں تئیں ہے مفلسی کا زور
پیسا کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر بھگوتے ہوئے اس کی پور پور
کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند (۱)

اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے کمان گر، مصور اور نقاش کی پسماندہ حالت کو حسبِ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

ہر دم کمان گروں کے اُپر پیچ و تاب ہیں
صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں مینا ساز مصور کباب ہیں
نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند (۲)

مرثیہ خوانی کا پیشہ:

مرثیہ خوانی کے پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھی سماج کے دوسرے طبقات کی طرح سے اقتصادی حالت خراب تھی۔ کیونکہ ان کی مالی حالت کا دارومدار ان طبقات پر تھا۔ اس طرح ان کو بھی اقتصادی طور پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

---

(۱) نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۳۶۷

(۲) ایضاً ص ۳۶۷

جعفر علی حسرت نے "مخمس در احوال شاہ جہاں آباد" میں ان کی اقتصادی حالت کا تذکرہ کیا ہے:

جنھوں نے مرثیہ پڑھ آتا تھے غلام امام
انھوں نے چھوڑ دیا اور سب جہاں کا کام
جہاں سنا کوئی شیعہ موا ہے، ہوگا طعام
چلے وہ کرتے تبرّا وہیں سے نام بنام
پھرے ہیں مردہ شو مولودیوں میں با اطفال (۱)

نجومیوں کا حال:

اس عہد میں نجومیوں کی بھی اقتصادی حالت بے حد ابتر تھی۔ کیونکہ ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار حکمراں طبقے پر تھا۔ لیکن جب بادشاہوں کی فضول خرچی اور عیاشی کے باعث اقتصادی حالت خراب ہوگئی۔ تو ان کے روزگار کا ذریعہ بھی بند ہوگیا۔ دوسری طرف عوام کی بھی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ حالانکہ بادشاہ، عوام علم نجوم میں اعتقاد رکھنے کے باوجود مالی حالت سے مجبور تھے۔ اس طرح سے سماج کے دیگر طبقات کی اقتصادی بدحالی کا اثر نجومیوں کی اقتصادی حالت پر براہ راست پڑ رہا تھا۔

جعفر علی حسرت نے نجومیوں کی اقتصادی پسماندگی اس طرح پیش کیا ہے:

جنھوں نے شوق سے اپنے پڑھا تھا علم نجوم
انھوں کے اختراب اس رصد میں ہوئے ہیں شوم
انھوں کی نوکری ملتی رصد پہ ہے معلوم
مگر کہ قرعہ کو لے اپنے فن سے ہو محروم
بیاض و حمرہ کو پڑھ کر بنے ہیں وہ رمال (۲)

کاتبوں کا حال:

اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد میں ہوئی اقتصادی بدحالی کا اثر کاتبوں کی اقتصادی

---

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۹ (۲) ایضاً، ص ۵۸

زندگی پر بھی پڑ رہا تھا۔ شعراء نے ان کی بے کاری اور مفلسی کا جو ذکر کیا ہے اس سے ان کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ محمد رفیع سوداؔ، راسخؔ اور راغبؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں اس وقت یہ طبقہ جن اقتصادی پریشانیوں سے گزر رہا تھا، اس کا تذکرہ کیا ہے۔

سوداؔ کے مطابق کاتبوں کا حال:

جس روز سے کاتب کا لکھا جال میں تب سے
ہر صفحہ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے

وہ بیت ٹکے سیکڑے، لکھنے کو ہے محتاج
خوبی میں خط اب جس کا از خط بتاں ہے

یہ بھی تکلیف ہی سے کہتا ہوں ورنہ
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے

احیا ہو جو موتی کا زمانے میں نئے سر
خطاط اوتنی ہی رہی قور کہاں ہے

ہدیہ سوا پانچ ٹکے گذریمیں آکر
یا قوت پکارے جو بکاؤ قرآن ہے

ڈمری کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے(۱)

راسخؔ کے مطابق کاتبوں کا حال:

لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا
نوشتے پر اپنے ہیں گریاں سدا

بہت فکر روزی سے ہیں دردناک
قلم غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل ص ۳۶۶

کہیں ہیں بچارے کہ کس طرف جائیں
لکھا اپنی قسمت کا کیونکہ کر مٹائیں (۱)

راغبؔ کے مطابق:

جو کاتب کو دیکھو تو ہے درد ناک
قلم کی طرح اس کا سینہ ہے چاک
یوں ہی ہرزہ اوقات کھوتا ہے وہ
بہت اپنے (لکھے) کو روتا ہے وہ (۲)

جعفر علی حسرتؔ کے الفاظ میں:

جو خط کے لکھنے میں میر علی کے تھے ثانی
قلم کو ان کے ہے دن رات خون افشانی
لکھے ہیں ڈمری کو خط خط پشت لب کی مثال (۳)

اس طرح سوداؔ، راسخ، راغبؔ اور جعفر علی حسرتؔ نے جس طرح سے اس طبقے کی اقتصادی حالت پر روشنی ڈالی ہے وہ پر معنی ہے اور یہ اشعار انتہائی مؤثر ثابت ہیں۔

اس طرح اس عہد کی شاعری کے ذریعے اقتصادی حالت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس عہد میں سماج کا ہر ایک طبقہ اقتصادی طور سے مفلس حال تھا۔ جیسا کہ سوداؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں لکھا ہے:

آرام سے کٹنے کا سنا کچھ تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

---

(۱) راسخ کا شہر آشوب، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد دہلی، ۱۹۶۸، ص ۱۵۲
(۲) راغب کا شہر آشوب .... ص ۱۱۷
(۳) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، ص ۵۹

یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغہ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے(۱)

سودا نے مندرجہ بالا اشعار میں جس طرح سے مختلف طبقات کے افراد کی اقتصادی پسماندگی کو بیان کیا ہے اس سے اس معاشرے کی ابتری کا نقشہ نمایاں ہو جاتا ہے۔اس طرح ملازم پیشہ، شاعر، مولوی، سوداگر، کاشکار وغیرہ طبقات جن پر سماجی زندگی کی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے، وہ سب مفلس حال تھے۔

شاہ ولی اللہ نے اقتصادی حالت میں اصلاح سے متعلق لکھا ہے کہ ''مالیہ کے لگانے اور ٹیکسوں کے مقرر کرنے میں بادشاہ یا حکومت کو عادلانہ قوانین کا اتباع کرنا چاہئے۔جن سے کہ رعیت کی آمدنی پر بھی غیر معمولی بوجھ نہ پڑے اور حکومت کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں۔ چنانچہ ہر ایک شخص اور ہر ایک کی آمدنی پر ٹیکس نہ لگایا جائے۔ جملہ اقوام عالم کے مدبرین اس پر متفق اور ان کا یہ اتفاق معقول وجوہات پر مبنی ہے کہ ٹیکس صرف ان لوگوں پر لگائے جائیں جو دولت اور ثروت کے مالک ہوں یا ان کے پاس اموال نامیہ ہوں۔مثلاً وہ مال مویشی جن کو ان کا مالک افزائش نسل کے لیے پالتا ہے۔ نیز اموال تجارت اور زمین جن پر فصل کاشت کی جاتی ہے(۲)

اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی ملک کے کمزور ہونے یا پھر زوال پذیر ہونے کے پیچھے اس عہد کے اقتصادی حالات بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی ملک یا سلطنت کا انحصار عموماً اقتصادی حالت پر ہوتا ہے۔ جب مغل سلطنت کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی تو اس کا اثر سلطنت کے ہر ایک ادارے پر پڑا۔اس طرح شعراء نے اس عہد کی اقتصادی حالت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت پر معنی اور افسوسناک ہے۔ یہ تمام شعراء دہلی دربار سے وابستہ تھے اور انہوں نے دہلی کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اشعار لکھے ہیں۔☆

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اوّل، ص ۳۶۷

(۲) شاہ ولی اللہ، حجتہ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص ۲۹۴ تا ۲۹۵

باب چہارم

معاشرتی حالات

باب چہارم

معاشرتی حالات

اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد میں سیاسی واقتصادی حالات اتنے نازک ہو گئے تھے کہ اس کا اثر معاشرے پر براہ راست پڑ رہا تھا اس طرح معاشی بدحالی سے معاشرے میں عدمِ توازن پیدا ہو گیا تھا زوال کے زیرِ اثرِ اقدار کے بکھرنے سے جو تبدیلیاں اندر ہی اندر معاشرے میں پیدا ہو رہی تھیں ان کا شدید دباؤ معاشرے کو اپنی گرفت میں لے کر بحرانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ سلطنت میں انتشار کے باعث عوام بالکل مایوس ہو گئی تھی اس طرح مایوسی کے عالم میں لوگوں نے وہ راستہ اپنایا جس پر چل کر اس پر آشوب زمانے کو وقتی طور پر بھلایا جا سکے۔ اخلاقی قدریں بے وقعت ہو گئی تھیں۔ دین کے مسائل سے لوگوں کو بہت کم سروکار تھا۔ معاشرے سے بہادری، شجاعت اور عسکریت کا جذبہ ختم ہو گیا تھا۔ حکمران طبقہ (بادشاہ، امراء، وزراء، عمائدین اور درباری) جس کو معاشرے کا محافظ سمجھا جاتا تھا ان میں بدعنوانیت پیدا ہو گئی حکمراں طبقے کے غلط کردار کا اثر معاشرے پر پڑنا لازمی تھا۔ اس طرح عوام بھی اسی راہ پر چلنے لگی جو راہ بادشاہ اور امراء نے اختیار کر رکھی تھی۔ سارا معاشرہ عیش پرستی، آرام طلبی، بدعنوانی اور اخلاقی بدحالی میں مبتلا تھا اور شدت کے ساتھ پرانے رسم و رواج اور طور طریقوں میں محو تھا تو ہم پرستی، رسم پرستی نے مذہب کی اصل جگہ لے لی تھی۔ نذر و نیاز، حاجت روائی کی منت، مشکل کشائی کی لئے نذر و نیاز ماننا، قربانیاں پیش کرنا، چڑھاوے چڑھانا، نہایت تفرع اور اعتقاد کے ساتھ ان کو حاجت روا سمجھ کر حاجتیں مانگنا، طواف کرنا، قدم بوسی، عرضیاں لکھ کر لٹکانا، شیرینی، پھول اور خوشبو میں چڑھانا وغیرہ رسومات ادا کی جاتی

تھیں۔ جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دہلی کا کوئی میلا ٹھیلا، بزرگانِ دین کے اعراس، بازار اور تفریحی مقامات ایسے نہ تھے جہاں تفریح اور عیاشی کے سوا کوئی دوسرا شغل ہوتا ہو۔ مجنوں (۱) نانک شاہ کا تکیہ جمنا ندی کے کنارے ایک بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔

اس طرح دہلی کے عوام و خواص وہاں برائے تفریح جایا کرتے تھے۔ چونکہ اس معاشرے کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اس لئے اس کا ہر عمل اور ہر فعل فکر و خیال سے عاری تھا۔ اس دور کی شاعری سے ان تمام برائیوں کی ترجمانی ہوتی ہے جو اس دور کے معاشرے میں موجود تھیں۔ حاتم نے مندرجہ ذیل اشعار میں زوال پذیر معاشرے کی صورت حال کو جس طرح بیان کیا، اس سے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ امراء جن کا معاشرے میں اعلیٰ مقام تھا وہ اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے بدحال تھے اور اسفل طبقات ابھر رہے تھے۔ مسخرے مصاحب بن گئے تھے اور بادشاہوں میں عدل و انصاف باقی نہیں رہا تھا۔

امیر زادے ہیں حیران، اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخے سے ہر دن تلاش مال کے بیچ
وہی گھمنڈ امارت ہے پھر خیال کے بیچ

خدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دشوار

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں کے بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں کے بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں
تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں

گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

---

(۱) یہ مقام آج بھی مجنوں کا ٹیلا کے نام سے مشہور ہے

رذالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں
پہن لباس سب کو سج دکھاتے ہیں
مسی پہ پان کوکھا، سرخ رو کہاتے ہیں
غرور غفلت و جوبن کی مدھ میں ہیں سرشار
روپے، اشرفی اچھالیں ہیں رات دن صراف

مقیش وبادلے میں غرق ہیں کناری باف
کتاب خانے کے وارث ہوئے ہیں مفت صحاف
نہاری پڑ کار دوکاں پر کرے ہے کلمہ ولاف
ہمیشہ سونے و روپے میں کھیلتا ہے سنار (۱)

جب سلطنت پر لعل کنور اور اس کے رشتے داروں جیسے کم اہل لوگوں کا اقتدار قائم ہوگا تو معاشرے کا بگڑنا فطرتاً لازمی تھا۔ مغل سلطنت کے ابتدائی عہد میں ان طبقات کو انکی حیثیت و قابلیت کے مطابق ہی عہدے دیئے جاتے تھے لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ان کی حیثیت میں اس قدر اضافہ ہوگیا تھا کہ وہ دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے لگے اور ان کی سفارش دربار میں چلنے لگی۔ اس عہد کے تقریباً ہر ایک شاعر نے معاشرتی اقدار کے زیر ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ جعفر زٹلی نے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والوں کی ذلت و بربادی اور نااہلوں کے عروج و اقتدار کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح کیا ہے۔

سمند خستۂ محتاج بوئے دانہ و کاہ
خچر ہمیشہ بگلگشت سرخوشی و سرور
پلنگ بردر خرگوش رفتہ حاجت مند
ہزبر جستہ پناہ و توسل لنگور

(۱) ظہور الدین حاتم، دیوان زادہ، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵، ص ۱۹۱

نشستہ بیخ مغیلاں بجائے نخلِ رطب
زقوم رستہ سراسر بمزرعۂ انگور
خبیث خفتہ بنازو و خسیس وارد داد
نجیب لقمۂ نانے زعامِ نا مہجور

دریں زمانہ نہ یکے بہائے ہیزم دعود
تمیز نیست یکے رابوئے چرم و بخور
نماند عزت علم و ادب، نہ پیر و پدر
نہ قدر زمزم و کوثر نہ قربِ سر مۂ طور

نماند قدر شب قدر دو حرمت رمضان
شداست رائج و شائع دروغ و فسق و فجور(۱)

ظہورالدین حاتم کا اس پہلو کے بارے میں کہنا ہے:

جو زیر دست تھے سو ان دنوں میں زور ہوئے
جنہوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار(۲)

مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ اہل کمال سمجھے جاتے تھے وہ عموماً گویئے، بین نواز، طبلچی، سارنگئے اور اسی قسم کے لوگ تھے۔

اس طرح اس دور میں طوائفیں اتنی اہم ہوگئیں تھیں کہ شرفاء ان سے ملنے کے لئے ہمیشہ بے چین رہتے تھے۔ان کی ایک پوری قوم پرورش پا رہی تھی۔جن کی سرپرستی امراء و وزراء

(۱) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ص ۳۵
(۲) ظہورالدین حاتم، دیوان زادہ، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵، ص ۱۹۲

اور مغل بادشاہ کرتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کے محلے کے محلے آباد تھے۔ مغل عہد کے ابتداء میں بھی دربار میں رقاصائیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا دخل محدود ہوتا تھا۔ انکو ان کی حیثت کے مطابق ہی رکھا جاتا تھا لیکن اورنگ زیب کے جانشین اپنے فرائض سے اس حد تک غافل تھے کہ اپنا سارا وقت رقاصاؤں کی صحبت میں گذارتے تھے۔ جس کا اثر معاشرے پر پڑ رہا تھا۔ اس وقت مذہبی اور غیر مذہبی کوئی تقریب ایسی نہیں تھی جس میں رقص وسرور کو اہمیت نہ دی جاتی ہو بادشاہ سے لیکر تمام معاشرہ اس رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بادشاہ وامراء شکار یا دوسری مہمات پر طوائفوں کو لے جانا اپنی شان سمجھتے تھے۔

درگاہ قلی خاں نے اُدبیگم نامی ایک طوائف کا ذکر اس طرح کیا ہے ''ادبیگم پائجامہ نہیں پہنتیں، جسم کے نچلے حصے پر خامئہ نقاش سے رنگین پائجامہ کے انداز کی رنگ آمیز کرالیتی ہیں۔ کم خواب کے تھان میں جو گل بوٹے ہوتے ہیں جس پر قلم سے بالکل اسی طرح کے گل بوٹے بنواتی ہیں۔ اس انداز میں امراء کی محفلوں میں جاتی ہیں پائجامہ اور اس رنگ آمیزی میں کوئی فرق نہیں کرسکتا'' (۱)

طوائفیں یوں تو عرصہ دراز سے ہندوستانی معاشرت کا اہم حصہ بنی ہوئی تھیں لیکن دہلی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس طبقے کا عروج پہلے سے اور بھی زیادہ عام ہو گیا۔

طوائفوں سے دل چسپی ایک ایسی روایت بن گئی تھی جن پر عمل کرنا شان امارت و نفاست سمجھی جاتی یہ ایک عام رجحان بن گیا تھا۔ اس طرح اس عہد میں طوائفیں تمدن ومعاشرت پر اثر انداز تھیں۔ خواص وعام کی زندگی میں ان کی چھاپ بڑھتی جارہی تھی۔

''امراء کے درباروں کا بھی یہی حال تھا۔ چوں کہ جنگ وجدال سے وہ منہ موڑ چکے تھے اور اپنا بیشتر وقت انہی تفریحی لہو ولعب کے مشاغل میں صرف کرتے تھے، وہ نور بائی اور دیگر طوائفوں کے مکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے، انہیں ہزاروں روپے صرف کرکے اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے'' (۲)

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتبہ ومترجمہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۸

(۲) محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۵۱

جعفر علی حسرت کا اس پہلو کے بارے میں کہنا ہے:-

کسی کو حسن پرستی و عاشقی سے شوق
کسی کو مطرب و مے سے کسی کو زہد سے ذوق (۱)

بھینا ے فیل سوار مشہور رقاصہ تھی۔ محمد شاہ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ وزیر الملک قمر الدین خاں اس کے عشق میں ایسے گرفتار تھے کہ اس کے گھر خود جانے میں بے عزتی محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس رقاصہ کے بارے میں نواب درگاہ خاں کا کہنا ہے ''مشہور رقاصاؤں میں ہیں طائفہ داروں کی سردار ہیں چوبداران کے ملازم ہیں۔ امراء سے برابر کے رشتے سے ملتی ہے۔ سفارشی خط لکھتی ہیں اور لوگ انہیں قبول کرتے ہیں ایک زمانے میں اعتماد الدولہ سے خاص تعلق تھا۔ اور وہ ان کے گھر آتے ہیں۔ ایک دفعہ نواب اعتماد الدولہ نے مے نوشی کے ظروف یعنی ساغر و مینا وغیرہ تحفے کے طور پر پیش کئے۔ چونکہ ان میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی قیمت ۷۰ ہزار روپیہ تھی۔ اسی طرح درگاہ قلی خاں نے نور بائی ڈومنی کے بارے میں لکھا ہے

> ''دلی کی ڈومنیوں میں ہیں ان کی شان و شکوہ کا یہ حال ہے کہ امراء ان سے ملاقات کی التجا کرتے ہیں۔ ان کا گھر دولت مندوں کے گھروں کی طرح ہر قسم کے شان و شکوہ کے سامان سے بھرا ہوا ہے۔ اور ان کی سواری کے جلو میں'' امراء کی سواری کی طرح چاؤش اور چوبدار ہوتے ہیں۔ عام طور سے ہاتھی کی سواری کرتی ہیں۔ جب امراء کے گھر جاتی ہیں تو امراء تحفے میں رونمائی کے طور پر ہر ایک رقم جواہر پیش کرتے ہیں اور انکے گھر خاص رقم پیشگی بھیجتے ہیں'' (۲)

اورنگ زیب کے تقریباً سبھی جانشین طوائفوں اور گویوں کی نہ صرف سرپرستی کرتے

(۱) جعفر علی حسرت، کلیات حسرت، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶، ص ۵۵
(۲) نواب درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳، ص ۳۷

تھے بلکہ ان کو دربار میں خاص منصب بھی دیئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے اس عہد میں رقص وسرود کا فن عروج پر تھا۔ محمد شاہ رنگیلا کے دربار میں ۲۲ طوائفیں اور ۲۴ گویئے ملازم تھے۔ نور بائی بھی اس کے دربار سے وابستہ تھی۔ مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں رقاصاؤں اور گانے والیوں کے علاوہ نعمت خاں بین نواز، تاج خاں قوال، باقر طنبورچی، حسن خاں ربابی، غلام محمد سارنگی، نواز گھانسی رام پکھاوجی، حسین خاں ڈھولک نواز، شہباز دھمدھمی نواز، وغیرہ اور گانے والوں میں قاسم علی معین الدین قوال، برہانی قوال، برہانی امیر خانی، رحیم خاں جہانی، شجاعت خاں، ابراہیم خاں اہم تھے۔

تاباںؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں عہدِ محمد شاہ کے ایک امیر عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی محفلِ رقص وسرود کا نقشہ اس طرح بیان کیا ہے:

سدا صحن میں اس کے رہتا تھا رنگ
سدا تھی نوائے دف ونے و چنگ
کلاونت و قوال سب مل کے وہاں
بموسیقی استاد تھے بے گماں

جو قوال قول و غزل خواں تھا وہاں
عرب محو مدہوش اسرار تھا وہاں
کوئی ٹپہ دھرپت کو گاتا تھا وہاں
ترانے سے دل کو لبھاتا تھا ہے وہاں

عجب مل کے سازوں سے ہوتا تھا رنگ
کہ تھی واں فلاطوں کی بھی عقل دنگ
کہیں باجتے تھے ستار و منہ چنگ
کہیں خنجری اور کہیں جل ترنگ

کہیں نے کہیں تھا جلا جل کا شور
بجاتا تھا قانون کو کوئی زور
غرض راگ، سازوں کا یہاں تک تھا شور
کہ پہنچے ہے کب شور یوم النشور

کہیں رقص کرتے تھے مہ طلعتاں
کہیں دید کرتے تھے ساغر کشاں
یہ سب خوبرو یانِ ہندی نژاد
نمکسار زاد و نمک سار ساز

خوشی ہو کے آتے تھے جب رقص میں
انہیں دیکھ آتے تھے سب رقص میں
غرض کیا کہوں بزم میں اسکی کی بات
کہ اندر کا بھی وہاں اکھاڑہ تھا مات

رسم ورواج:

اٹھارہویں صدی کے ابتداء میں رسم رواج کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی ان رسموں اور توہمات پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ توہم پرستی کا یہ عالم تھا اگر کوئی رسم رہ جائے تو خصوصاً عورتیں بعد میں ہونے والی تکلیف کو اس رسم کے رہ جانے کی اہم وجہ مانتی تھیں۔ اس طرح معاشرے میں ہر ایک فرد خاص طور سے عورتیں ان رسومات کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ توہم پرستی پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا قتیل نے لکھا ہے

"اگر کوئی شخص ان کو توڑتا ہے تو عورتوں کو بدشگونی کے خیال سے ساری رات نیند نہیں آتی اور اس قسم کی شادی کو بہت برا اور منحوس خیال کرتی ہیں اور شادی کے بعد جو کچھ مثلاً دردسر، دردشکم، بخار، داماد کی قوت باہ میں فساد اور اولاد کی موت یا دولھا دولھن کی موت سامنے آتی ہے۔ اس رسم کے توڑنے کے سبب سمجھتی ہیں۔ عورتوں کے نزدیک جو کچھ ہوتا ہے اس کی رسومات کا ترک کرنا ہوتا ہے۔ (۱)

---

(۱) محمد حسین قتیل ہفت تماشہ، مترجمہ محمد عمر، دہلی، ۱۹۶۸، ص ۱۴۱ تا ۱۴۲

شادی کی رسمیں:

شادی کے موقع پر لڑکا، لڑکی کو زرد کپڑے پہنانا، کلائی میں ریشمی کلاوا باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک دولھا کے ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا۔ اس کے علاوہ ساچق، مائیوں بٹھانا، مہندی لے جانا، سہرا باندھنا، راستہ روکنا، نیگ مانگنا، رقص و سرود، روشن (۱) چوکی، بابا فرید (۲) کا پوڑہ اس میں لوگوں کی اتنی عقیدت تھی جیسا کہ مرزا قتیل نے لکھا ہے ''اگر کوئی چاہے کہ شادی میں بابا فرید کا پوڑہ نہ ہو تو ممکن نہیں کہ اسکی بات اثر کر جائے'' (۳)

اس وقت شیعوں میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ وہ بھی شکر کو کاغذ میں باندھتے تھے دراصل اسی رسم کو بابا فرید کا پوڑہ کہا جاتا تھا۔ یہ پوڑہ ساچق کے دن دوسری چیزوں کے ساتھ دلہن کے گھر جاتا تھا۔

مٹکیوں کو پوت کر ان پر پھول بوٹے بنائے جاتے تھے ان میں نُقل بھری جاتی تھی۔ جو شکر اور چنے سے تیار ہوتی تھی اس کو پستہ، بادام اور مصری سے پر کرتے تھے اور چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے تھے۔ ہر ایک تخت کو ایک مرد اٹھاتا تھا۔ اسی طرح آرائش کے تختے جو کاغذ اور ابرق کو کاٹ چھانٹ کر کاغذی پھول کے درختوں کو سبز پھولوں کے ساتھ ان تختوں میں جماتے تھے اور میوادار درخت بناتے تھے ان سب کے علاوہ پری طلعت عورتوں اور ہر قسم کے مرد یعنی مغل، فرنگی اور دکھنی لوگوں کے کاغذی مجسمے بنا کر سب کو الگ الگ تخت پر بٹھاتے تھے۔ اس طرح ساچق کو دولہا کے سبھی رشتے دار نقارہ اور نوبت بجاتے ہوئے دولہن کے گھر لے جاتے تھے۔

---

(۱) اس وقت دولھا کے گھوڑے یا ہاتھی کے آگے روشن چوکی بجانے کا رواج تھا۔ اس سے مراد مٹی کے دو چھوٹے نقارے تھے جن کو لکڑی سے نہیں ہاتھ سے بجاتے تھے اس کی آواز کو بانسری کی آواز سے رنگین تر کرتے تھے۔

(۲) شیخ فرید جو حضرت عمر فاروق کی اولاد میں ایک بزرگ ہوئے ہیں ان کا مزار ملتان کے پاس پٹن نامی جگہ میں زیارت گاہ خلائق ہے اور جو خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ اور مرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید تھے اور امیر خسرو کے پیر و مرشد شیخ نظام الدین بدیوانی کے مرشد تھے۔

(۳) مرزا محمد حسین قتیل ہفت تماشہ، ص ۱۴۱ تا ۱۴۲

سودا کا اس رسم کے بارے میں میں کہنا ہے۔

کاٹا ہوا وہ سر تھا ساچق کا جتا وا
گردن کا خط زخم تھا مٹکے کا کلاوا

دولہن نے لیے آستین دولہا کی چڑھاوا
ساچق کا یہ دستور ہی کہہ کس کے وطن کا(۱)

اس رسم کے اگلے دن یا پھر دو تین دن بعد منہدی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔اس رسم میں دولہن کے گھر سے دولہا کے لئے مہندی لائی جاتی تھی۔مہندی کی رسم عموماً رات کو ادا ہوتی تھی۔ سالیاں دولہا کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگاتی تھیں۔ دولہا اپنی حیثیت کے مطابق انکو نیگ دیتا تھا۔اگر کوئی سالی دولہا سے عمر میں بڑی ہوتی تھی تو وہ اسکو سلامی دیتی تھی۔

بارات:۔

اس دن دولہا کو غسل کرا کر زردوزی کا لباس پہناتے تھے۔اس کے بعد اس کے سر سے سہرا لٹکاتے تھے سہرا باندھنے والوں کو نیگ دیا جاتا تھا۔میر تقی میر نے دولہا کے سہرے کے بارے میں اس طرح لکھا ہے

سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار دیکھئے کب تک رہے(۲)

سودا نے اس پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

لا کے اے مالنیان دن کی چمن سے پھلوار
گوندھو نوشہ کے لئے آج گل زخم کے ہار

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد دوم، مرتبہ نیاز احمد، لاہور، ص ۱۸۷
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ٦٧٦

تار گتھنے کا کرو سہرے کے لو ہو کے دھار
گاؤ دروازے پر تم باندھ کے یہ بندھنوار (۱)

اسکے بعد دولہا گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہو کر بڑے تجمّل کے ساتھ دُلہن کے گھر کے لئے روانہ ہوتا تھا۔ میر حسن نے شادی کا ایک ایسا ہی سماں ''سحر البیان'' (۲) میں پیش کیا ہے۔ برات کی روانگی کے منظر کو انہوں نے مندجہ ذیل اشعار میں اس طرح نمایاں کیا ہے:

وہ دلہا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا
لگا دیکھنے اٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کی لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا

کوئی پالکی میں چلا ہو سوار
پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
وہ شہنائیوں کی سہانی دُھنیں
جنہیں گوشِ زہرہ مفصّل سنیں

وہ نوشے کا گھوڑے پہ ہونا سوار
وہ موتی کا سہرا جوا ہر کا ہار
ٹھہر کر وہ گھوڑے کا چلنا سنبھل
ہما کی وہ دونوں طرف مورچھل

براتی اِدھر اور اُدھر جوق جوق
وہ آواز سرنا اور آواز بوق
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
کہ ہر رنگ کی جس سے دونی بہار

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد دوم، ص ۱۹۷

(۲) اس میں میر حسن نے شہزادی بدر منیر اور شہزادے بے نظیر کی شادی کا منظر پیش کیا ہے۔

سراسر وہ مشعل کے ہر طرح جھاڑ
کہ جوں نور کے مشتعل ہوں پہاڑ
تماشائیوں کا جدا اک ہجوم
پتنگے گریں جوں چراغاں یہ جُھوم

کڑکنا وہ نوبت کا باجو کے ساتھ
گرجنا وہ دھونسوں کا ڈنکوں کے ساتھ(۱)

برات جب دلہن کے دروازے پر پہنچ جاتی تھی تو اس وقت ایک اور رسم ادا ہوتی تھی جسکوں دھنگانا کہتے تھے۔ جب تک دھنگانہ (۲) نہیں لیتے تھے دروازہ نہیں کھلتا تھا۔

اس وقت بعض گھروں میں یہ رسم بھی رائج تھا دولہا کے منہ میں لگام لگا کر لگام دولہن کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ اور اکثر اس کو گھوڑے کی طرح کھڑا کر کے اس کی پیٹھ پر زین رکھتے تھے اور دولہن کو اس پر سوار کرتے تھے تاکہ جس طرف وہ عنان گھمائے دولہا بھی اسی طرح گھومے اس کا یہ مطلب تھا کہ تمام عمر ایک ایسے گھوڑے کی طرح جو اپنے سوار کا تابعدار ہوتا ہے۔ اس دور میں موجودہ دور کی طرح چوتھی کی رسم بھی ادا کی جاتی تھی۔ شادی کے چار دن کے بعد دولہن اپنے شوہر کے ساتھ میکے واپس جاتی تھی تو دونوں خاندان کی عورتیں رنگین پانی ایک دوسرے پر چھڑکتی تھیں اس کے بعد پھولوں سے بنے زیور مع چند ٹوکریوں کے جس میں ہری ترکاریاں اور پھل ہوتے تھے وغیرہ داماد کے گھر سے لے جا کر دولہا دولہن کو پنھاتے تھے۔ یہی پھل اور ترکاریاں داماد کے اور دولہن کے اور انکے خاندان کی عورتوں کے پھینک کر مارتے تھے دولہن والیاں بھی اسی طرح کرتی تھیں۔ پھلوں اور ترکاریوں کے علاوہ چوب گل اور منقش زردوزی کا کام کئے ہوئے سیاہ و سرخ لکڑی کے گولے یا زردوزی سے کڑھی ہوئی گیندیں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ولادت سے لیکر شادی تک کی رسوم

---

(۱) میر حسن، مثنوی سحرالبیان، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، لکھنؤ، ۱۹۸۷، ص ۲۶۰ تا ۲۶۲
(۲) راجپوتوں کی ایک رسم کا نام

پابندی سے ادا ہوتی تھیں اس طرح معاشرے میں ہر طبقہ اپنی مجموعی حثیت کے مطابق ان رسومات کو ادا کرتا تھا۔ اس وقت یہ رسوم صرف شاہی گھرانوں تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ معاشرے کا ہر طبقہ ان کو ادا کرتا تھا۔ سماج ان کی پابندی قریب قریب شرعی احکام کی طرح ضروری سمجھتا تھا۔ اس طرح ان رسوم کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ توہم پرستی سے تھا۔

امرد پرستی:

اس دور کے معاشرے کا نمایاں رجحان امرد پرستی کی طرف تھا جس کا ذکر اس عہد کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ جعفر زٹلی نے اس پہلو کو اس طرح نمایا کیا ہے۔

لونڈے ہوئے ہیں گھر یہ گھر کھاویں نوالہ تر بتر
بھوکے پھریں چاکر نفر، بی بی مٹی احوال ہے (۱)

اس طرح میر، آبرو اور سودا کی شاعری میں بھی امرد پرستی کا ذکر ملتا ہے۔ میر تقی میر نے مندرجہ ذیل شعر میں امرد پرستی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

آبرو کے مطابق:

جو لونڈا نام سن امرد پرستی کا چڑھے چونگے
میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں جوں لاسا

آبرو کی مثنوی ''درموعظہ آرائش معشوق'' جو اسی موضوع سے متعلق ہے۔ اسمیں انہوں نے بتایا ہے کہ حسن کو نکھارنے کے لئے لڑکے کو کون کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور اپنی شخصیت کو پرکشش بنانے کے لئے کونسا لباس اور کیا وضع قطع اختیار کرنی چاہئے۔

محمد شاہ رنگیلا کے دور میں امرد پرستی کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ اس دور میں لڑکوں نے

---

(۱) میر جعفر زٹلی مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۵

غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ محمد شاہی دور کے امراء عظام میں اعظم خاں اپنی امرد پرستی کی وجہ سے مشہور تھا مرزا منو اس دور کے ایک اور امیر زادے تھے وہ فنِ امرد پرستی میں اتنے ماہر تھے کہ اکثر امیر زادے اس علم کے ضروری گر ان سے سیکھتے تھے۔ اس وقت فن امرد پرستی نے اتنی ترقی کی کہ نہ صرف استادی شاگردی کے رشتے ہو گئے بلکہ لڑکوں کی سجاوٹ، وضع قطع، آرائش اور حسن و جمال کے طور طریقے بھی مقرر ہو گئے نواب درگاہ قلی خاں نے بھی امرد پرستی کا ذکر کیا ہے انہوں نے اس موضوع سے متعلق لکھا ہے۔ ''سبز رنگ امرد ہیں بارہویں سال میں ہیں رقص میں عجیب و غریب شوخیاں اور ادائیں دکھاتے ہیں ان کے گانے کے جادو نے دنیا کو مفتوں اور خلق کو مجنوں بنا دیا ہے۔ اس عمر میں موسیقی میں ایسی مہارت حاصل کی ہے کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا کلی ہیں لیکن گل ہائے شگفتہ سے مقابلہ کرتے ہیں اگرچہ چراغ کی لو سے زیادہ نہیں ہیں لیکن آفتاب سے ہمسری کے موعی ہیں سامعہ کو حسرت ہے کہ وہ (سلطانہ کا گانا سننے کے لئے) محدود ہے۔

باصرہ کو اپنی نگاہ کی کم ظرفی پر شرمندگی ہے ایک رات کو ہمارے ایک دوست نے محفل سجائی بہت دیر تک ان (سلطانہ) کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا تمام رات عیش و انبساط میں گذری۔ دوستوں کے دلوں میں دوبارہ ان کی صحبت کی حسرت باقی ہے۔ شوق پھر اسی محفل کا متمنی ہے۔

درگاہ قلی خاں نے میاں ہینگا نامی ایک اور ''امرد'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ انکا کہنا ہے کہ ''ایک مرد ہینگا سعد اللہ خاں کے چوک پر رقص کرتے ہیں ان کا طمطراق تو دیکھئے چینی کی طرح ان کا رنگ اور گل یاسمین کی طرح ان کا لباس سفید ہوتا ہے دار الخلافہ کے قلعے کے سامنے روز مجمع لگاتے ہیں تماشائیوں کو مرضی کے مطابق ہنگامہ پیرا رہتے ہیں۔ انکا رقص دیکھنے کے لئے ثقہ لوگ چوک کی سیر اور نفائس و نوادر خریدنے کے بہانے آتے ہیں

اور بینگا کے حسن کے جلوؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور گاہک بے تکلف اور بغیر کسی تصنع کے انکے مجمع کے اطراف میں تیز رفتار گھوڑوں سے اتر کر خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس سیر گاہ کے چاروں طرف اتنے ہاتھی اور گھوڑے ہوتے ہیں کہ انکی گنتی ممکن نہیں اس تماشے کے چاروں طرف اتنے لوگ بیٹھے یا کھڑے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے لوگ ضروری چیزیں خریدنے کے بجائے یہاں کی تفریح میں مصروف ہوجاتے ہیں سامان خریدنے کے لئے جو رقم لاتے ہیں وہ سب گنوا کر خالی ہاتھ گھر جاتے ہیں۔ انکے خرام اور نازک ادائیں دنیا کو برباد کردیتی ہیں۔ وہ جن پر ملتفت ہوجائیں وہ تباہ ہوجاتا ہے ان کا گورا رنگ سانولے رنگ سے باج اور انکا سبزہ خط چمن کے سبزے سے خراج حاصل کرتا ہے۔ سفید لباس میں ایسے خوبصورت لگتے ہیں جیسے شام کے وقت صبح کی پو پھٹی ہو یا گل چاندی بے اختیار فضائے چمن میں بکھر گئی ہو۔ غروب آفتاب تک جلوا گوئی کرتے ہیں اور خاصی رقم اکٹھا کرکے گھر چلے جاتے ہیں اگر چہ عزیز و اقارب بہت دعوت دیتے ہیں لیکن کسی کے گھر نہیں جاتے جو کوئی ان شیفتہ ہے وہ انکے گھر جا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔'' (۱)

مصحفی کا کہنا ہے۔

نظر آتا ہے یہ لونڈا مجھے ہر جائی سا
قتل عالم میں ہلاکو سے قدم آگے بڑھا (۲)

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۳۴ تا ۳۵
(۲) غلام ہمدانی مصحفی، دیوان مصحفی، ص ۴۹

چھڑیاں:

اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عہد میں چھڑیاں بڑی دھوم سے منائی جاتی تھیں۔ اس وقت شاہ مدار اور سرور سلطان کی چھڑیاں بے حد مشہور تھیں ملک کے دور دراز کے حصوں سے عقیدت مند لوگ جھنڈے لیکر شاہ مدار کے مزار پر جمع ہوتے تھے۔ ''چھڑیوں'' کی وجہ سے تسمیہ غالباً یہی تھی کہ قافلے جھنڈیاں اور علم لے کر چلتے تھے جو ''شاہ مدار کے جھنڈے'' کہلاتے تھے یہاں ہفتوں تک جشن رہتا تھا۔ اس طرح اس موقع پر ہندو مسلمان بڑی تعداد میں تماش بین کی حیثیت سے آتے تھے۔ چھڑیوں کے موقع پر بزرگوں کے مزار کے قریب مختلف انواع واقسام کی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔

میر حسن نے شاہ مدار کے عرس کے موقع پر ہونے والی چھڑیوں کا نظارہ مثنوی گلزار ارم میں پیش کیا ہے اس کے چند بند مندرجہ ذیل ہیں۔

مکن پوری کو چھڑی چلتی تھی واں سے
اُٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر
چلے ہم وہاں سے چھڑیوں ساتھ مل کر

زبس میوات کا اکثر تھا عالم
عجائب مہو شاں تھیں اس میں باہم
کوئی پردے سے تھی چہرا دکھاتی
کوئی آواز کچھ گا کر سناتی

کوئی چلتی اُتر اٹکھیلیوں سے
کوئی بیٹھتی ہی جی لیتی دلوں سے
جہاں ملتا کہیں پانی کا منبع
ہواں ہوتا پریزادوں کا مجمع

کنویں پر یوں نظر آتا ہر اک ماہ
کہ جوں یوسف کھڑا ہو بر سر چاہ
کوئی لیتا مٹھائی اور کوئی پان
کوئی جاتا کسی کے پاس انجان(۱)

نذرونیاز میں عقیدت:

مرزا قتیل کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی شیعہ عورتیں، سنی عورتوں کے اثر صحبت اور اپنی جہالت کے باعث بعض اکابر صوفیہ کی نذر کا کھانا پکاتی ہیں اور ان کو من جملہ اولیاء مشکل کشا سمجھتی ہیں مثلاً سید جلال بخاری مثلاً سید جلال بخاری جو (امام زماں علی تقی عایہ السلام کے لڑکے جعفر کذاب کی نسل کے ایک مرد تھے۔ان کے والد کا نام سید ابوالمؤید تھا۔وہ سہروری سلسلے میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے بیعت تھے، جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے اور مخدوم جہانیاں جہانگیر دان کے نواسے تھے۔بچوں کو سلامتی کے لیے عورتیں چاول پکا کر مٹی کے برتن میں بھرتی ہیں اور دہی اور شکر اس پر ڈال کر شریف اور غریب مسلمانوں کو کھلاتی ہیں''(۲)۔

اس طرح اس عہد میں عوام کو''شاہ مدار''(۳) میں اتنی عقیدت تھی کہ جیسا کہ قتیل نے لکھا ہے''شاہ مدار کی نذر کے لیے اپنے بچوں کے سر پر چوٹی رکھتے ہیں جب بچہ اس عمر کو پہنچ جاتا ہے جس کی نیت سے انھوں نے چوٹی رکھواتے وقت کی تھی اسے شاہ مدار کے مزار پر لے جاتے ہیں جو مکن میں واقع ہے اور وہاں جا کر اس کے بالوں کو منڈواتے ہیں اور دیگوں میں نذر کا کھانا پکوا کر مساکین وغرباء کو کھلاتے ہیں بعدازیں اس بچے کی موت سے بے خوف ہو جاتے ہیں''(۴)۔

---

(۱)میر حسن، مثنویات میر حسن، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۵، ص ۱۳۶ تا ۱۳۹
جس وقت میر حسن دہلی سے لکھنؤ آرہے تھے وہ زمانہ شاہ مدار کے عروس کا تھا اس وقت قافلے در قافلے مع چھڑیوں کے جارہے تھے میر حسن نے دہلی سے لکھنؤ کا سفر ان ہی مداریوں کے قافلے کے ساتھ کیا تھا۔
(۲)محمد حسین قتیل ہفت تماشہ، ص ۱۵۳
(۳) کچھ لوگ ان کو سید بتاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ جلب کے یہودیوں میں سے تھے بعد میں انھوں نے اسلام مذہب کو قبول کیا تھا اور درویشوں کی جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔
(۴)محمد حسین قتیل ہفت تماشہ، ص ۹۸ تا ۹۹

اسی پہلو کے مدِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں رسم پرستی نے حقیقی مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ سرور سلطان جو شاہ مدار کی طرح ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کی حاجت روا سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں عوام کی بڑی عقیدت تھی۔ اس طرح اس عہد میں مذہبی امور کی خلاف ورزیاں ہو رہی تھیں۔

شیخ سدو جن کی پرستش ہندو اور نچلے طبقے کے مسلمان کرتے تھے ان کی نظر کے لیے زیادہ تر بکرا اور بکری ذبح کر کے پکایا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جو کھانا شیخ سدو کی نظر کے لیے پکایا جاتا تھا وہ ہر کسی کو نہیں کھلایا جاتا تھا کیونکہ ان لوگوں کا ایسا ماننا تھا کہ کوئی اگر ایک دفعہ بھی ان کی نذر کا کھانا کھا لیتا ہے تو اس کی گردن پر سوار ہو کر شیخ سدو ہر سال اس سے نظر کا بکرا وصول کرتے ہیں۔ اس طرح جو شیخ سدو کی نیاز کا کھانا کھاتا ہے اس پر بھی شیخ سدو کی نیاز کا بکرا واجب ہو جاتا ہے۔ اگر جو شخص شیخ سدو کے نیاز کا خیال نہیں رکھتا تو اس کا سر خود بخود چکر کھانے لگتا ہے اور دونوں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اگر چہ وہ شیخ سدو کی نذر پوری کر دیتا ہے تو وہ صحت یاب ہو جاتا ہے اس طرح کی عقیدت لوگوں کے دل میں تھی۔ اس وقت لوگوں کا ایسا عقیدہ تھا کہ کچھ ایسے بزرگ گذرے ہیں جن کی روح عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ مرزا قتیل کا کہنا ہے

> ''رذیل عورتیں غسل کے بعد بھڑکیلا لباس پہن کر اور عطر لگا کر سر کو دھننا شروع کر دیتی ہیں اور دوسری عورتیں ان کے ارد گرد ڈھولک باجا لے کر ایک خاص لے میں مدح کے اشعار گاتی ہیں، پھر یہ عورتیں ساز بجانے والی عورتوں کے ساتھ سروں کو گھماتی ہیں۔ یہ سر ہلانا اس بات کی علامت ہے کہ شیخ سدو ان کے اندر حلول کر رہے ہیں اور وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہیں اور جب سر جھماتے جھماتے ہوش میں آتی ہیں اور تھوڑا سا دم لیتی ہیں تو ساز بجانے والی اور دوسری عورتیں اکٹھا ہو کر اور بعضے مرد بھی جو مرتبہ عقل میں عورتوں کے برابر ہوں خواہ ہندو ہو یا مسلمان ان سے جو شیخ سدو کی بیت اختیار کر لیتی ہیں اپنی مراد مانگتے ہیں'' (۱)

---

(۱) محمد حسین قتیل ہفت تماشہ، ص ۱۰۷

محمد رفیع سودا نے مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک“ میں اس واقعہ کو اس طرح نمایاں کیا ہے:۔

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدو اس پر اماسک کھاکے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

ضاحک یہ سن کے بولا تم نے زبان نکالی
بے آج کو کہا ہے کل دو گے مجکو گالی
بکرے کی شکل یاں تو نے گوری ہے نہ کالی
بی بی کو اور تم کو گھر کر دیا ہے خالی
بکرا وہ دے گی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا

میراں یہ سن کے بولے پھر کہیو کیا کہا جی
میں اس سوا نہیں کچھ اور حرف جانتا جی
بکرا اگر نہ آیا چھوڑوں گا کر پچا جی
گالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بچا جی
آگے ہے ڈھول دھنیا میں تمکو کہہ سنایا

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں کوڑے
گڑ کے تو گلگلے ہیں اور تیل کے پکوڑے
میٹھا کرو جو منہ ڈھیلے کے ہیں گندوڑے
تب شیخ سدو بولا سنتا ہے دہی کے
بھینسا ہی لے کے چھوڑوں خاطر میں کیا تو لایا (۱)

---

(۱) محمد رفیع سودا، کلیات سودا، جلد اول، ص ۳۴۰ تا ۳۴۱

تعویذ گنڈوں میں عقیدت:

اس عہد میں عوام تعویذ گنڈوں پر بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ شاہی حرم سے لے کر ادنیٰ درجے کے مسلمان تک ہر طبقے میں تعویذ اور گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کا رواج تھا۔ عوام کا تعویذ گنڈوں پر اعتقاد اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ امراض جسمانی کے امداد کے لیے بھی ان کا سہارا لیا جاتا تھا۔ مثلاً تعویذ برائے دفع تپ لرزہ، برائے دفع درد چشم، برائے دفع جدری اور برائے محافظت زراعت وغیرہ اس عہد کے شعراء کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ان عقائد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے مندرجہ ذیل چند شعر میں اس عقیدے سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔

ہو کچھ آسیب تو اس چاہیئے گنڈا تعویذ
اور جو ہو عشق کا سایہ تو کرے کیا تعویذ
زور تعویذ کا چلتا تو عرب میں یا دو
کیا کوئی ایک بھی مجنوں کو نہ دیتا تعویذ

کوہکن کو کس واسطے کا ٹاکرتا
دیتے غمخوار نہ کیا اس کے تئیں لا تعویذ

اس طرح اس عہد میں بعض لوگ تعویذ، فلیتے اور عمل کے ذریعے جنّات پانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دونوں کو جو تعویذ و فلیتہ و عمل سے
تسخیر کیا عالم جنّات تو پھر کیا
اس عمر دو روزہ میں اگر ہو کے بخوبی
سب چھان لئے راض و سماوات تو پھر کیا

ایک دم میں ہوا ہو گئے سب عملی و نظری

تھے یاد جو اسباب و علامات تو پھر کیا

مندرجہ ذیل بالا اشعار اس دور میں تو ہم پرستی، عوام کے مختلف اعتقادات اور خیالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اعراس:

اس عہد کی معاشرت میں اجتماعی تفریح کا سب سے اہم ذریعہ ''عرس'' تھا اس وقت لوگوں نے عرس کو بے حیائی اور عیش پرستی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ ان اعراس میں عموماً قوالیوں، رقاصاؤں کے مجرے وغیرہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ درگاہ قلی خاں نے ان عرس میں ہونے والی بے شرمائی و بے حیائی کا ذکر کیا ہے ناگل نامی بزرگ کا جو دہلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خانی کے قریب تھا۔ یہاں ہر ماہ عرس منعقد کئے جاتے تھے جہاں عورتیں بج دھج کر جاتی تھیں دراصل ان کے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور ہوتا تھا۔

ناگل بزرگ کے مزار پر عرس کا منظر درگاہ قلی خاں کی زبانی:

> ''ہر مہینے کی ستائیس تاریخ کو عاشق مزاج عورتیں خوب بج دھج کر جوق در جوق زیارت کے لئے آتی ہیں انکا مقصد کچھ اور ہوتا ہے جن مردوں سے ان کا تعلق ہوتا ہے ان سے مل کر داد عیش دیتی ہیں۔ بہت سے مجرد اور پردیسی لوگ خوب بن سنور کر اس امید میں کہ شاید انہیں کوئی قبول کر لے۔ اس جلوہ گاہ میں خود کو پیش کرتے ہیں۔''(۱)

جہاں مزاروں پر لوگوں کا ہر وقت مجمع لگا رہتا تھا۔ وہیں دوسری طرف مساجد میں سناٹا پڑا رہتا تھا حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر ہونے والے عرس کے بارے میں

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۳۰

درگاہ قلی خاں نے لکھا ہے:

''ہر بدھ کو عوام و خواص زیارت کرتے ہیں اور قوال پورے ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر قوالی کرتے ہیں۔ خاص طور سے صفر کے مہینے کے آخری بدھ کو یہاں زبردست ہجوم ہوتا ہے۔ دلی والے بہت سج دھج کر یہاں آتے ہیں اور زیارت کے بعد ان باغوں کی سیر کرتے ہیں جو روضۂ مبارک کے نواح میں واقع ہے اہل حرفہ جا بجا دکانیں سجاتے ہیں اور تماشائیوں کی پسندیدہ اور مطلوبہ چیزیں پیش کرتے ہیں اتنی بڑی تعداد میں مطرب نغمہ سرا ہوتے ہیں کہ ان کی آواز سامعہ پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ ہر گوشہ و کنار میں نقال اور رقاص دادِ خوش ادائی دیتے ہیں۔عرس مبارک ربیع الاول کی چودہ تاریخ کو منعقد ہوتا ہے (زائرین) اس آستان جنت نشان کو بوسہ دے کر فخر حاصل کرتے ہیں (درگاہ کے) چاروں طرف اتنے خیمے لگتے ہیں کہ جگہ باقی نہیں رہتی تمام رات قوال باری باری قوالی کرتے ہیں اور مشائخ و صوفیائے کرام کے لئے وجد و حال کا سامان فراہم کرتے ہیں (۱)

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ہوئے عرس میں موسیقی سے لیکر رقص و شراب کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا تھا۔ جہاں اعلی طبقے سے لیکر نچلے طبقے کے لوگ یہاں لطف اٹھانے کے لئے آتے تھے اسطرح مذہبی تقریبات تک میں بھی رقص و سرود حد سے زیادہ دخل تھا۔عرس کی صبح دہلی کے تمام نقال شام تک مجرا کرتے ہوئے زیارت کرنے والوں کو بہت محظوظ کرتے تھے۔

بہادر شاہ اول خلد منزل کے عرس کے موقع پر عشرت پسند لوگ جس طرح بے حیائی کرتے تھے۔

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی ص ۳۳

اس کا تذکرہ درگاہ قلی خاں نے اس طرح کیا ہے:

''ہر گوشہ و کنار میں اپنے محبوبوں کے ساتھ ہم آغوش ہوتے ہیں اور ہر کوچہ و بازار میں عیاش لوگ خواہشات نفسانی کے پورے ہونے پر رقص کرتے ہیں میخوار محتسب سے بے خوف بدمست اور شہوت طلب مزاحمت کے خیال سے بے نیاز شاہد پرستی میں مصروف رہتے ہیں امردوں اور نوخطوں کا وہ ہجوم کہ زیدوں کی توبہ ٹوٹ جائے اور بے مثال جذبے کے ساتھ وہ آہو پسر جونیکی کی بنیاد دیں ہلا دیں جہاں تک نظر جاتی ہے خوب صورت چہرے اور جہاں تک دکھائی دے گیسوؤں کے حال نظر آتے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر عیش و عشرت کے سامان فراہم ہوتے ہیں کہ ایک عالم کی مراد پوری ہو جائے خیانت کے اسباب اس درجہ موجود ہوتے ہیں کہ دنیا بھر کے بدکار جسمانی لذت حاصل کر سکیں۔ یہاں تو حالت یہ ہے کہ ذرا ہوش میں آئے تو کسی امرد نے آنکھ ماری، ابھی اسکے حسن سے آنکھیں روشن کیں کسی بے شرم عورت کا پیغام پہنچا۔ نواب اور امراء و روسا سے کوچے بازار اور گوشہ و کنار امیروں اور فقیروں سے شور انگیز رہتے ہیں۔ مطرب اور قوال مکھیوں سے زیادہ اور محتاج و سائل مچھروں سے افزوں تر قصہ مختصر اس طرح اس شہر کے کمین و شریف ذہنی اور جسمانی لذتیں حاصل کرتے ہیں۔ اور ان ہنگاموں کی طرح سے آنکھیں پھیر لینا محض بصیرت ہے۔ (۱)

ان اعراس کے علاوہ حضرت شاہ ترکمان کے عرس کے موقع ساتویں رات کو ناچنے والے ایک عزیز کی قبر جو احدی پورہ میں دفن ہے حاضر ہوتے تھے۔

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۳۱

اوران کی قبر کو شراب ناب سے غسل دیتے تھے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عرس عوام کو دلچسپی اور تفریح کا ذریعہ ہوا کرتے تھے ان میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوتے تھے اور اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز ہوتے تھے۔

مذہبی رہنماؤں کی حالت:

اس عہد میں مذہبی رہنما صدہا قسم کی گمراہیوں کا شکار تھے ان کی گمراہی کا اثر معاشرے پر براہِ راست پڑ رہا تھا دینی مسائل سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ وہ دنیا داری میں اس قدر محو تھے کہ امراء رؤسا سے منسلک ہو کر سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسی سیاست جسکا مقصد دوسروں کو فلاح و بہبود نہ تھا۔ بلکہ اپنے لئے جاہ و منزلت کا حاصل کرنا تھا۔ خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ ''اس دور کے علماء عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے ان کا سارا وقت دوراز کار بحثوں میں صرف ہوتا تھا قرآن وحدیث سے ان کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔'' (۱) اسطرح انہوں نے مذہبی امور کا رشتہ اپنے ذاتی اثر ورسوخ کے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔ انکو نہ تو تصوف کا عملی تجربہ تھا اور نہ ہی کتابی علم تھا اس زمانے کے دنیادار مشائخ نے کشف وکرامات کو وسیلہء روزی بنا رکھا تھا۔ او رراسخ العقیدہ مسلمانوں کو طرح طرح سے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے تھے۔

جعفر زٹلی کے مطابق:

تسبیح ہزار دانہ کی دن رات پھیر پھار
لیتے نہ نام حق کا کبھی منہ سے ایک بار
ہونٹوں میں بڑ بڑاتے تھے ناحق کو بے شمار
دکھلا کے مکر رکھتے تھے دنیا کو پھیر پھار

کہتے نعوذ باللہ زباں و دہن ستی (۲)

---

(۱) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۳۵۹
(۲) میر جعفر زٹلی، کلیات میر جعفر زٹلی، ص ۱۷۲

میر تقی میرؔ نے مشائخ کے کردار میں آئی بدعنوانیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

شیخ کو اس بھی سن میں ہیگی ہوس
تنگ پوشی سے چولی جاوے جس
ہوئے گا سن شریف ساٹھ برس
دانت ٹوٹے گیا ہے کلہ دھنس
دیکھ رنڈی کو بہ چلے ہے رال

جامے کو خوب سا چناتے ہیں
خال رخسار پر بناتے ہیں
مہندی بھی پتلی سی لگاتے ہیں
ناز کرتے قدم اٹھاتے ہیں
دیکھا کرتے ہیں آرسی میں جمال

دل میں دُھن ہے جو عیش و عشرت کی
پوچھتے ہیں دوائی شہوت کی
باتیں ہیں رنڈیوں کی صحبت کی
دیکھے ہے کوئی کتاب حکمت کی
کرتے ہیں بہمنین کا استعمال

محور عنائی کتنے ہیں اللہ
مسی سے کرتے ہیں مسوڑے سیاہ
رکھتے ہیں سر پہ اب ہمیشہ کلاہ
شانہ سے کام ہے گہہ و بے گاہ
کپڑے نارنجی سر پہ اودی شال

قیر و چرکیں لباس تنگ معاش

ساتھ رکھتے ہیں ایک ہوئے تراش

قینچی لیتے ہیں گاہ و گہہ منقاش

ہر سر مو پہ اس سے ہے پر خاش

لوگ کہتے ہیں شیخ ہیں چنڈال (۱)

اسی طرح صوفیوں کے کردار میں بھی بدعنوانی پیدا ہوگئی تھی ان کے درمیاں اچھے اعمال کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ پہلے صوفی خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے مشکل راستوں کو جیسے توبہ، توکل، خوف، رضا، صبر وغیرہ کو خدا کی رضا مانتے تھے۔ اور یہی نجات کا ذریعہ مانتے تھے یہی نہیں بلکہ وہ اپنے کو دربار سے یعنی سیاست سے دور رکھتے تھے لیکن اٹھارہویں صدی کے صوفیوں نے اپنے علم کو دولت کے حصول کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انکے کردار میں عیش پرستی جیسے برے اعمال نے جگہ لے لی تھی۔ صوفی محض ایک اصول بن کر رہ گئے تھے دراصل میں اس وقت کے ماحول نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس طرح اسی وجہ سے اسلام کی اصلی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ درگاہ قلی خاں کا کہنا ہے

> ''چوں کہ اس سماج میں صوفیا کی بہت عزت ہوتی تھی اس لئے تصوف سماجی عزت و وقار حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ بن گیا اور بد سے بدکردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کر کے پیسہ کمانے کا ایک بڑا ذریعہ بنا لیا۔ انہی علماء نے المجاز قنطرۃ الحقیقت کے فلسفے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر امرد پرستی جیسے غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنا لیا انہیں حرم اور میکدہ دونوں سے خلوص تھا۔ ان کی راتیں میخانوں اور دن خانقاہوں میں گزرتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کو باقاعدہ دکانیں بنالیا گیا'' (۲)

---

(۱) میر تقی میر، کلیات میر، ص۹۵۴ تا ۹۵۵

(۲) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص۳۰

اس عہد میں زیادہ تر لوگ حالات کے زیر اثر امن وسکون تصوف میں ڈھونڈ تے تھے۔جسکی وجہ سے لوگوں نے تصوف کو ''کاروبار'' بنا رکھا تھا۔اس طرح عہد میں جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی شاہ فخر الدین دہلوی، حضرت مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسی اہم ترین شخصیات ہوئیں تو وہیں دوسری طرف کچھ دنیادار صوفی لوگوں کو دین سے غافل کرر ہے تھے مختصر طور پر کہا جاسکتا ہیں کہ وہ تصوف کے سرچشمے قرآن وحدیث سے ہٹ ویدانت کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔

اس طرح اس زمانے کے علماء نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کو فراموش کر دیا تھا۔جاہ وحشمت دولت وثروت کی تحصیل ہی ان کا اصل مقصد تھا۔علماء کے ساتھ ساتھ قاضی بھی اپنے فرائض سے بے بہرہ تھے جیسا کہ حاتم نے مندرجہ ذیل مصرعے میں بیان کیا ہے۔ ؎

یہاں کے قاضی ومفتی ہوئے ہیں رشوت خور(۱)

اس طرح انہوں نے رشوت خوری کا بازار گرم کر رکھا تھا حالت یہ تھی کہ اگر کوئی غریب ومفلس مسلمان مرجاتا اور نائب قاضی نہ آتا تو عوام کا عقیدہ تھا کہ ایسی صورت میں میت کی روح گھر سے باہر نہیں جائے گی اور اگر اس شخص کے ورثہ سے رقم معینہ باعث کم مقدوری کے ادا نہ ہو سکے تو مع اہل عیال کے اس قدر نحس اور ناپاک سمجھا جاتا تھا کہ اس کے ہم پیشہ لوگوں کو اس کے ساتھ بیٹھ کر خورد نوش گوارہ نہیں ہوتا اور حد یہ تھی کہ اسے لوگ آگ اور پانی تک نہیں دیتے تھے۔تب وہ مجبوراً چوری ڈکیتی یا قرض وغیرہ سے زر حاصل کر کے قاضی کی خدمت کرتا۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی رہنماؤں کی بے راہ روی سے عوام بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔

بازار:

دہلی کے بازار جو اٹھارہویں صدی کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا اہم ترین مرکز

---

(۱)ظہورالدین حاتم، دیوان زادہ، ص ۱۹۱

تھے۔ درحقیقت دہلی کی طرز معاشرت کا اصلی نمونہ ان بازاروں میں دیکھا جا سکتا تھا درگاہ قلی خاں نے ''مرقع دہلی'' میں چاندنی چوک اور چوک سعداللہ خاں نامی دو بازاروں کا ذکر کیا ہے اس وقت ان بازاروں میں جو رونق اور چہل پہل رہتی تھی اس کا تذکرہ اس عہد کے شعراء نے بھی کیا ہے۔ میر حسن نے مندرجہ ذیل اشعار میں چاندنی چوک کے بارے میں اس طرح لکھا ہے

یہ دل . چسپ بازار تھا چوک کا
کہ ٹھہر ے جہاں پر وہیں دل لگا

جہاں تک رستے تھے بازار کے
کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے (۱)

چاندنی چوک اس عہد میں بھی معاشرتی زندگی کا آئینہ تھا یہ بازار دہلی کا سب سے زیادہ دل کش مقام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس بازار کے بیچ و بیچ نہر بہتی تھی۔

اس نہر کے دونوں اطراف مختلف قسم کے ساز و سامان کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں پر آج ہی کی طرح ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ اس بازار میں قہوہ خانہ بھی تھا یہاں عام لوگوں کے دہلی کے شاعروں کا مجموعہ ہر وقت لگا رہتا تھا ''مرقع دہلی'' میں اس پہلو کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

''چوک کے عین میدان میں جو قہوہ خانے واقع ہیں ان میں ہر روز سخنور رجمع ہو کر دادِ سخن و بذلہ دیتے ہیں اپنے بلند مرتبے کے باوجود امرائے عالیشان اس چوک کی سیر کے لئے آتے ہیں یہاں روز عجیب وغریب اشیاء اور نوادرات اتنے نظر آتے ہیں کہ اگر قارون کا خزانہ مل جائے تب بھی کافی نہ ہو'' (۲)

اس بازار کی اہمیت اس واقعہ میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کسی موقع پر ایک امیر

---

(۱) میر حسن، مثنویاتِ میر حسن، ص ۱۵ تا ۱۶

(۲) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۲۹

نوجوان چاندنی چوک کی سیر کو جانا چاہتا تھا تو اس کی ماں نے اپنے بیٹے کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے ایک لاکھ روپیہ دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے "اس رقم سے ہر چند تم اس چوک کے نفائس و نوادر نہیں خرید سکتے لیکن چونکہ تم چوک کی سیر کو جانا چاہتے ہو اس حقیر رقم سے اپنی پسند کی کچھ ضروریات خرید لینا" (۱) اس طرح اس واقعہ سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اس عہد میں بھی لاکھوں روپے چاندنی چوک میں خریداری کے لئے ناکافی تھے۔

اسی طرح چوک سعد اللہ خاں کے بازار میں بھی ہر وقت رونق رہتی تھی یہ بازار جامع مسجد اور لال قلعہ کے دلی دروازے کے درمیان واقع تھا۔ اس بازار کی چہل پہل کے بارے میں درگاہ قلی خاں نے اس طرح لکھا ہے۔ "اس کا (چوک کا) ہنگامہ قلعے کے دروازے کے سامنے ہے اور اس کا مجمع جلوخانے کے سامنے ہے۔ سبحان اللہ ایسی کثرت سے رنگارنگ چیزیں ہوتی ہیں کہ ان میں نگاہ گُم ہو جاتی ہے۔ اور نگاہ نئی نئی چیزوں کی بہتات اور اپنی پسند کی چیزوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ ہر طرف خوش رو امرد اپنے رقص سے قیامت ڈھاتے ہیں اور ہر طرف قصہ گو کے شوروغل سے حشر برپا ہوتا ہے۔ واعظ ارباب عمائم کی طرح اکثر جگہوں پر منبروں کے انداز کی لکڑیوں کی کرسیاں بچھائیں۔ مہینے اور دنوں کی مناسبت سے مثلاً رمضان المبارک میں روزے کے فضائل پر حجۃ الحرام کے مہینے حج و عمرہ کی رسم و قربانی وغیرہ کے طریقوں اور محرم کے مہینے میں کربلا کے واقعات پر فصاحت کے ساتھ تقریریں کر کے انہیں عوام کو ذہین نشین کراتے ہیں۔

ایسی حالت کر دیتے ہیں کہ مجمع رونے لگتا ہے۔ اس طرح سے خوب روپیہ کماتے ہیں۔ بازاری لوگوں کو اس طرح کے مجمعوں سے بہت دل چسپی ہوتی ہے اور خام طلب لوگ پست ذوقی کی وجہ سے حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اکثر دو گھڑی رات گزارنے تک یہ واعظ و تذکرہ جاری رہتا ہے"۔

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۱۲۹

بخومی اور رمّال بھی بے وقوف بنانے میں سرگرم رہتے ہیں وہ لوگ مجمع لگائے لوگوں کے دلوں میں چھپے راز بتاتے ہیں لوگ اپنے خوش نصیبوں اور بدقسمتیوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں ان کے وعدوں اور پیشن گوئیوں سے خوش ہو کر لوگ اپنی استعداد کے مطابق انہیں رقم دیتے ہیں۔ رنگین تھیلیاں دکان پر سجاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تھیلوں میں (دوا تو کیا ہوتی) سڑک کی دھول ہوتی ہے۔ خود بیش بہا کپڑے اور پگڑیوں پر سرمہ پیچ لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور اپنی تقریر رنگین اور ادائے دل نشین کے ساتھ دواؤں کے خواص اور ان کے فائدے بیان کرتے ہیں کہ بیوقوف لوگ دوائیں خریدنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں کہ دکان میں خاک بھی نہیں بچتی۔ نقالوں اور بادہ فروشوں کی جگہیں مقرر وار بہت محفوظ ہیں یہ لوگ اپنے وقت پر حاضر ہو کر کمائی کرتے ہیں۔ اطراف اور اکناف امردوں اور نوخطوں سے بھرے ہوئے ہیں جیسے ہی نگاہ اٹھتی ہے کسی چکنے رخسار سے پھسل جاتی ہے جہاں کہیں بھی ذرا ہاتھ پھیلاؤ (معلوم ہوتا ہے) کسی حسین کی گردن میں ہے۔ اسلحہ فروش ہر قسم کے اسلحہ نیام نکال کر ان کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں تاکہ ان کے خریدار پیدا ہوں۔ کپڑا فروش مختلف رنگوں کے کپڑے ہاتھوں میں لئے ہوا میں اسی طرح لہراتے ہیں کہ صفحۂ ہوا شفق رنگ ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ خریدار کی نظر کسی رنگ پر تو مائل ہو عیش و عشرت کا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں پاس پاس ہی بکتی ہیں۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کا بازار تو ہوش گم کر دیتا ہے۔ باز جرہ کبوتر، بلبل اور تمام پرندوں کی اتنی بہتات ہے کہ جب تک کسی نے "منطق لطیرہ پڑھی ہو اور آصف و سلیمان کی صحبت نہ اٹھائی ہو ان پرندوں کو نہیں پہنچان سکتا۔ کتنے ہی دشت و بیاباں ویران کر کے ہر روز قسم قسم کے جانور یہاں لائے جاتے ہیں جنگلی جانوروں اور پرندوں کے شوقین اور خاص طور سے اکثر نوخیز جوان اور شور انگیز امرد شکار کے لئے یہاں آتے ہیں او تجربہ کار صیاد اس مرغزار میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں قفس عنصری اور پنجرۂ بشری (انسانی جسم) سے زیادہ رنگین اور خوب صورت پنجرے خواہشمندوں کے ہاتھوں فروخت کئے جاتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ انسانی ضرورت اور لذّت نفسانی کی چیزیں یہاں فراہم ہیں چونکہ یہ جگہ (چوک سعد اللہ خاں) قلعہ کے

سامنے ہے اور امراء و روساء کی آمد و رفت کا راستہ ہے اس لئے یہاں ہمیشہ محشر بپا رہتا ہے۔(۱)
اس طرح ان بازاروں کی وجہ سے دلی میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ میر تقی میر کا اس پہلو کے بارے میں کہنا ہے۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں (۲)

میلے:

اس عہد میں مختلف قسم کے نیم مذہبی اور سماجی میلے ہوتے تھے ان میلوں سے اہل دہلی کی رنگین مزاجی اور زندہ دلی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور کی دہلی اپنی سراسیمگی اور پریشان خاطری کے باوجود میلوں ٹھیلوں میں محو تھی۔ اس وقت ان میلوں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ زیادہ تر عقیدت مندی کے جذبات سے متحرک ہو کر آتے تھے لیکن کافی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی تھی جو اپنے ذوق تماشہ سے مجبور ہو کر ان میلوں کی سیر کرنے آتے تھے اس وقت ان لوگوں کے ہجوم سے خاص چہل پہل ہوتی تھی فائز نے بیان میلہ بہتہ نامی مندرجہ ذیل نظم میں اس عہد میں ہونے والی چہل پہل کو اس طرح بیان کیا ہے۔

آج بہتے کا یار میلا ہے
خلق کا اُس کنار ریلا ہے
مرد و زن سب چلے ہیں اس جا پر
خلق پھیلی کنارِ دریا پر
بہل و گاڑی میں سب چلیں نسواں
کوچہ بازار میں ہوا چیں چاں
اہل حرفہ چلا ہے سب اقسام
آج سب کا بنے گا اس جا کام

---

(۱) درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۲۶ تا ۲۸
(۲) میر تقی میر، کلیات میر، ص ۱۰۳

میوہ اور شیرینی ہے سب اقسام
اردو بازار بل گیا ہے تمام
سب ہے واں بلکہ دودھ چڑیا کا
یہ بھی معجزا تماشا کا

جائے اس جا امیر فیل سوار
خوب رویوں سے واں لگا بازار
ایک جانب میں بھگتیوں کا ہجوم
خال روشن سے ڈوبتے ہیں نجوم

مسخروں سے ہے گرم س بازار
ناچتے کو دتے ہیں کھاتے پچھاڑ
اور جانب میں ہے شراب فروش
مست اس جا ہیں کرتے ہیں جوش خروش

گل فروش ایک سمت بیچے ہلد
اس کی دوکاں پر ہوا ہے بہار
اس کے بیٹھا ہے آگے تنبولی
پھرتے بازار میں پکڑ کر ہاتھ

بہل و رتھ میں بھری ہیں سب عورات
آشنا ساتھ اپنے کرتیں بات (۱)

اسی طرح اس دور کی شاعری میں نجی زندگی کی تمام تفصیلات ملتی ہیں۔ جن سے بظاہر انفرادی شوق کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ میلوں ٹھیلوں کے علاوہ کچھ تفریحات بھی تھیں جیسے بلبلوں کا پالنا اور لڑانا، مرغ بازی، بلی اور بکری پالنے کا شوق اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل معاشرے کی دلچسپیوں کا مرکز بن گئے تھے جس لطف اندوز ہونے کا جذبہ عوام وخواص دونوں میں نمایاں تھا۔ میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی کے علاوہ دیگر ہمعصر شعراء نے بھی ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جیسے نظیر اکبر آبادی نے مندرجہ ذیل

---

(۱) فائز، دیوان فائز، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی، دہلی، ۱۹۴۶ء، ص ۲۱۵ تا ۲۱۷

اشعار میں پتنگ بازوں کے شوق کو اس طرح نمایاں کیا ہے۔

یاں جن دنوں میں ہوتا ہے آنا پتنگ کا
ٹھہرے ہے ہر مکاں میں بنانا پتنگ کا
ہوتا ہے کثرتوں سے منگانا پتنگ کا
کرتا ہے شاد دل دکو اڑانا پتنگ کا
کیا کیا کہوں میں شور مچانا پتنگ

کٹتا ہے جو پتنگ تو پھر لوٹنے اسے
دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے
کاغذ ذرا سا ملتا ہے یا ٹکڑے کانپ کے
جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر پڑے
پھر سوچئے تو کیا ہے ٹھکانا پتنگ کا (۱)

اس طرح نظیر اکبرآبادی کے مندرجہ بالا اشعار سے اس عہد کے تمدنی محرکات کی عکاسی ہوتی ہے۔

تہوار:

شاعری کے مطالعہ سے ہندوستان میں اس وقت منائے جانے والے تہواروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی واقفیت ہوتی ہے کہ اس وقت نہ صرف بادشاہ و امراء ہندوستانی تہوار مناتے تھے بلکہ عوام بھی پورے جوش و خروش سے ان تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوؤں کے بعض رسوم و اعمال اسلامی عقائد کے خلاف تھے۔

دسہرے کے تہوار کو نہ صرف ہندو مناتے تھے بلکہ مسلمان بھی مناتے تھے۔ خاص طور سے وہ مسلمان امیر جو شہر کے حاکم ہوتے تھے اس دن اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کر کے نقرئی و طلائی ساز و سامان اور زرنگار جھول کے ساتھ سونے چاندی کے حوضے اور عماریاں لگا کر فوج اور ذی مرتبہ مصاحبوں کو ساتھ لیکر نیل کنٹھ کا دیدار کرنے جاتے تھے۔ اس وقت ہندوؤں میں ٹیسو رائے نامی ایک اور رسم ادا کی جاتی تھی۔ بچے

---

(۱) نظیر اکبرآبادی، کلیات نظیر اکبرآبادی، ص ۳۶۲ تا ۳۶۴

دسہرے سے دس دن پہلے مٹی کی ایک صورت بناتے تھے اسے لکڑیوں پر لٹکاتے تھے اس کا نام ٹیسو رائے ہوتا تھا۔ شام کے وقت روزانہ کچھ بچے اور بڑے ملکر اپنے رشتے داروں کے دروازوں پر جاتے تھے اور لے میں بلند آواز میں ہندی کے بیت بڑھتے تھے اور ایک پیسہ یا اس سے زیادہ لے کر ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جاتے تھے اس طرح جو کچھ ان کو حاصل ہوتا تھا اسے جمع کر کے ان پیسوں سے مٹھائی خرید کر آپس میں بانٹتے تھے اسی طرح اس عہد میں دیوالی، ہولی، سلونو راکھی، اور مسلم تہوار جن میں عید، بقرعید، ربیع الاول، جشن نوروز وغیرہ تہوار بڑی دھوم دھام سے ہندو اور مسلم دونوں مناتے تھے۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تہواروں کی سماجی اہمیت نے شعراء کو ان موضوعات پر طبع آزمائی کے لئے آمادہ کیا۔ ہندوستانی معاشرے کے باہمی اختلاط و مشترکہ تہذیب کے جذبات کی ترجمانی شاعری میں ملتی ہے۔

اس عہد میں اقتصادی حالات پس ماندہ ہونے کی وجہ سے عوام حکمراں طبقے کی دیکھا دیکھی امرد پرستی، نشہ بازی، میلے ٹھیلے، عرس وغیرہ میں مبتلا ہو کر دنیا سے بالکل بے خبر تھی۔ معاشرہ عیاشی اور لہو ولعب کی طرف مائل تھا شاکر ناجی، حاتم، آبرو وغیرہ ہمعصر شعراء کی شاعری کے حوالے سے اسے عہد کے معاشرے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ سچی محبت کی تلاش میں سرگرداں تھا اسکی باطنی زندگی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی جسے وہ میلے ٹھیلوں میں جا کر بھلانا چاہتا تھا۔ احساس اقدار ختم ہو گیا تھا ہر فرد کے طرز عمل میں فرض شناسی کے بجائے خود غرضی آ گئی تھی شرک نے مسلمان گھرانوں میں اتنا دخل پا لیا تھا کہ مسلمان اور غیر مسلم میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ علوم دین کی جانب سے بے پروائی برتی جاتی تھی۔ تصوف کی بگڑی ہوئی شکل نے عوام و خواص کو اپنی طرف مائل کر رکھا تھا۔

با الفاظ دیگر اس عہد کی شاعری کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کا ابتدائی عہد نہ صرف سیاسی و اقتصادی اعتبار سے بلکہ سماجی اعتبار سے بھی پر آشوب زمانہ تھا۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی فکر دامن گیر رہتی تھی اس لئے عوام نے دنیاوی تفکرات اور رنج و آلام سے وقتی طور پر نجات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

باب پنجم

ماحصل

باب پنجم

ماحصل

اٹھارویں صدی کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا اس عہد کی شاعری کے ذریعے سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری کے ذریعے سے اس عہد کے ہر ایک پہلو کی ترجمانی کی جاسکتی ہے چاہے وہ سماج کے طبقات کے بارے میں ہو یا پھر سیاسی و اقتصادی زندگی کے بارے میں ہو۔ تاریخی ماخذ میں معاشرے کے ہر ایک طبقے کے بارے میں اتنی تفصیل سے معلومات نہیں ملتی، جتنی کہ اردو شاعری میں ملتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک تاریخی ماخذ کا سوال ہے زیادہ تر وہ سیاسی حالات تک ہی محدود ہیں۔ اس طرح زیادہ تر ہمعصر مورخین نے حکمراں طبقے کے متعلق ہی تواریخ لکھی ہیں جس طرح غیر ملکی سیاحوں کی سرگذشت کی تاریخی اعتبار سے اہمیت ہے اور ان کے سرگذشت کو بطور تاریخی ماخذ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ہم عصر شعراء کے کلام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس عہد کا وسیع پیانے پر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کسی بھی ملک کا ادب عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے اور اس ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں معاشرے کی تمدنی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ جس کو پڑھنے سے اس عہد کا تہذیب وتمدن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس طرح اٹھارویں صدی کے حالات کا شاعری کے حوالے سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اس عہد کے شعراء بھی اپنے سماج اور ماحول سے پوری طرح اثر لے رہے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ اس عہد کی شاعری تاریخ نویسی کے لیے ایک

مواد ہے۔ جس کی روشنی میں اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد پر ایک جامع تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ میر تقی میر، محمد رفیع سودا، قائم چاند پوری، جعفر علی حسرت اور جعفر زٹلی وغیرہ شعراء کی شاعری کو پڑھنے کے بعد نہ صرف دیگر طبقات کی بلکہ بادشاہ تک کی اقتصادی بدحالی کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے جیسے کہ نظیر اکبرآبادی نے معاشرے کے ہر طبقہ کی اقتصادی پسماندگی کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے۔ اسی طرح جعفر علی حسرت نے بھی دیگر طبقات کی اقتصادی حالت کو ''مخمس دراحوال شاہجہاں آباد'' میں تحریر کیا ہے۔ غرض کہ وہ طبقات جن پر سماجی زندگی کی ترقی کا انحصار تھا وہ سب مفلس حال تھے۔ اس عہد میں اقتصادی بدحالی کے سبب ہر طبقہ پریشان تھا۔ لگان میں اضافہ کی وجہ سے اور زمین کاشتکاری کے لائق ہونے کے باوجود کاشتکاروں کی حالت مفلس تھی جس کا ذکر میر تقی میر اور محمد رفیع سودا نے بھی کیا ہے اس عہد میں اجارہ داری نظام نے بھی کافی حد تک فروغ پالیا تھا۔ اس لیے کہ چھوٹے جاگیردار اپنی جاگیروں پر پوری طرح سے قابو نہیں پارہے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ٹھیکہ پر دے رہے تھے۔ اگرچہ اس وقت جاگیرداری نظام کو ختم بھی کردیا جاتا تو جاگیرداروں کا طبقہ بغاوت کے لیے آمادہ ہوجاتا۔

شعراء کا کہنا ہے کہ بادشاہ کی یہ حالت تھی کہ نہ تو اس کے ماتحت فوج تھی اور نہ ہی اس کے ماتحت ملک تھا۔ اس طرح سے اس سے وابستہ رہنے والے امراء اور ان سے متعلق متوسط طبقہ کا حال بے حد خراب ہوگیا۔ داخلی اور خارجی حملوں کی وجہ سے جاگیرداروں کا بھی شیرازہ بکھرنا لازمی تھا۔ فوجیوں کی بھی اقتصادی حالت پسماندہ تھی۔ نہ تو ان کے پاس سواری کے گھوڑے تھے اور نہ ہی ان کے پاس وردیاں تھیں جس کا ذکر ہمعصر شعراء نے بھی کیا ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ سپاہیوں کو کئی کئی مہینوں تک تنخواہ نہ ملنے کے باوجود بھی اس پیشے کو اپنائے ہوئے تھے۔ شاید مال غنیمت کی امید میں یہ پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں گے۔

تقریباً سبھی ہم عصر شعراء نے علماء، فضلاء، شعراء اور دیگر پیشہ وروں کی اقتصادی بدحالی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی معاشرہ کے باہمی اختلاط و مشترکہ جذبات کی ترجمانی شاعری میں کی ہے جیسے میر تقی میر اور نظیر اکبرآبادی نے عوامی

تہذیب وتمدن کوشاعری میں پیش کیا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں معاشرتی حالات کا عکس شدت سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں معاشرت کے ہر ایک پہلو جیسے لباس، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آداب وغیرہ جیسے دیگر پہلوؤں کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اس طرح اس عہد کے شعراء کے کلام میں معاشرے کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سیاسی حالات بھی خراب تھے۔ اس وقت جہاں ایک طرف مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہورہی تھی تو دوسری طرف صوبوں میں خودمختار ریاستوں کی ازسرنوتعمیر ہورہی تھی اور ہنروفن کی سرپرستی مغل سلطنت کے بجائے یہ ریاستیں کررہی تھیں۔ انتظامِ سلطنت میں بدانتظامی اور لاقانونیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ملازم سفارش سے یا پھر رشوت دے کر اعلیٰ عہدے حاصل کررہے تھے۔ ملک اور سیاست کی باگ ڈور کم لیاقت اور نااہل مصاحبوں کے ہاتھ میں تھی جس کا ذکر جعفر زٹلی، حاتم اور میر تقی میر نے بھی کیا ہے۔ اس طرح سیاسی واقتصادی لحاظ سے اٹھارویں صدی کا ابتدائی عہد ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں اہل، نااہل سمجھے جاتے تھے اور ان نااہلوں کو اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا جیسا کہ لعل کنور اور اس کے رشتے داروں کا اقتدار جہاندار شاہ کے عہد میں حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس طرح جو مرتبہ ان کو شہ زوری وشورہ پشتی سے حاصل ہوگیا تھا اسے وہ اپنا حق اور اپنے آپ کو واقعی حق دار سمجھتے تھے۔ معاشرے کی اعلیٰ سطح پر وہ لوگ آگئے تھے جن کے پاس نہ تو کوئی علم تھا اور نہ ہی کوئی ہنر۔ جیسا کہ محمد رفیع سودا نے مندرجہ ذیل شعر میں لکھا ہے:

کہوں کیا انقلاب اس وقت میں یارو زمانے کا
جسے سب عیب سمجھتے ہیں وہ نظروں میں ہنر ٹھہرا

اس طرح وہ لوگ جن کا سماج میں دبدبہ تھا وہ بالکل پست ہوگئے تھے اور غیر اہم طبقات ابھر رہے تھے۔

اس وقت دلی میں جو سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی وہ صرف دلی تک ہی محدود نہ تھی تقریباً سارا ہندوستان اس انتشار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس طرح مرکزی حکومت کی

کمزوری کے باعث جو بدنظمی پیدا ہو رہی تھی اس کا اثر چاروں طرف پڑ رہا تھا۔ نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے باعث دلی میں جو تباہ و بربادی پھیلی اس کو میر تقی میر اور محمد رفیع سودا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس تباہی و بربادی کا ذکر میر تقی میر نے شاعری کے علاوہ ''ذکرِ میر'' میں بھی کیا ہے۔ ان حملوں کے باعث جو تباہ و بربادی دلی میں پھیلی اس کا ذکر اس عہد کے تقریباً ہر ایک شاعر نے کیا ہے۔ تاریخی ماخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ میں ان بیرونی اور داخلی حملوں کو روکنے کی اہلیت نہیں تھی اور نہ ہی انتظام سلطنت میں آئی بدعنوانیت کو دور کرنے کی قابلیت رکھتے تھے جیسا کہ قائم چاندپوری نے واضح شاعرانہ انداز میں جہاندار شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کو نااہل قرار دیا ہے۔ اسی طرح محمد رفیع سودا اور دیگر شعرا نے بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس وقت دربار میں امراء کی مختلف جماعتیں تھیں۔ انفرادی حسد، رشک، رقابت سے قطع نظر دربار میں یہ جماعتیں ایک دوسرے کی دشمن بنی ہوئی تھیں۔ ایک جماعت مغلوں کی تھی اس میں ایرانی اور تورانی شامل تھے۔ اپنی تعداد اور اپنے سرداروں کی فوجی اور انتظامی امور میں یکساں لیاقت کی بنا پر انھیں انتظام سلطنت میں دخل تھا۔ اسی طرح ایرانیوں کی الگ ایک جماعت تھی، افغانوں کا الگ ایک گروپ تھا۔ جس کی وجہ سے سیاسی حالات میں کشمکش پیدا ہو رہی تھی۔ درحقیقت یہی طاقتور جماعتیں ملک کے سیاسی حالات پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی تھیں اور یہی جماعتیں مغل شہنشاہیت کے زوال کی بھی اہم وجہ بنیں۔

دوسری طرف اورنگ زیب کے جانشین سیاسی طور پر کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل بھی تھے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر وہ کون سے حالات تھے جس کی وجہ سے اورنگ زیب کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے وہ تقریباً سبھی انتظام سلطنت میں نہ تجربے کار تھے۔ تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہزادوں کو اکثر قید میں رکھا جاتا تھا۔ یہ روایت ابتداء سے چلی آ رہی تھی کہ تخت کے دعویداروں کو یا تو قتل کرا دیا جاتا تھا۔ جس کے باعث ان شہزادوں پر برے اثرات پڑے۔ قید میں ان کا واسطہ عورتوں سے یا پھر خواجہ سراؤں سے پڑتا تھا۔ عورتوں کے ساتھ رہنے سے ان میں نسوانی عادات و خصوصیات پیدا ہو جاتی تھیں۔

دوران قید نہ تو جنگی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ ہی ان کو کسی سے ملنے کی اجازت تھی۔ اس طرح قید میں رہنے کی وجہ سے ان شہزادوں کو حکومت سے متعلق کوئی تجربہ نہیں ہوتا تھا۔ جیسے رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ رنگیلا، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی وغیرہ بادشاہ تخت نشینی سے پہلے یہ قید میں زندگی کا ایک لمبا حصہ گذار چکے تھے۔ جیسا کہ جب عالمگیر ثانی بادشاہ بنا تو اس وقت اس کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ اس سے پہلے وہ بچپن سے ہی قید میں رہا تھا۔ لیکن جب وہ بادشاہ بنا تو اس میں اتنی اہلیت نہ تھی کہ وہ مغل سلطنت کو زوال سے بچا سکے۔

اس طرح ایسی صورت حال میں رعایا کے دلوں سے ان کے لیے احترام ختم ہوگیا۔ کیونکہ عوام بادشاہ کو اپنے تحفظ کا ضامن سمجھتی تھی۔ یہ بادشاہ سیاسی طور پر کمزور ہونے کے باعث امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت اتنی خراب تھی کہ ایک بادشاہ اور گدا کے درمیان فرق کرنا مشکل تھا۔ جس کا ذکر اس عہد کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد جتنے بھی مغل بادشاہ ہوئے وہ سلطنت کے تمام امور کے لیے وزراء پر منحصر تھے۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ اس عہد میں ایک طرف مرکزیت ختم ہو رہی تھی تو دوسری طرف الگ الگ ریاستیں قائم ہو رہی تھیں۔ تو اس کے پیش نظر اٹھارویں صدی کے ابتدائی عہد کو زوال پذیر عہد بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان خودمختار ریاستوں میں ان حکمرانوں نے اپنی قائم کردہ ریاستوں میں ہر طرح کی اصلاحات کرنی شروع کردی تھیں۔ خاص طور سے انھوں نے زراعتی اصلاحات کی طرف دھیان دیا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زراعی آمدنی پر ہی حکومت کا انحصار ہے۔ اسطرح بنجر زمینیں جواب تک ویران پڑی ہوئی تھیں ان کو زیرِ استعمال لایا جارہا تھا۔ جس کی اہم ترین مثال حیدر علی کے عہد میں میسور ریاست ہے۔ جو اس کی کاوشوں کی وجہ سے زرخیز اور خوشحال ہوگئی یہ ریاستیں نہ صرف زراعت کی طرف دھیان دے رہیں تھیں بلکہ تجارت کی طرف کی بھی دھیان دے رہی تھیں۔ مغل سلطنت کی کمزوری کے باعث یہ ریاستیں تاجروں کی بھی سرپرستی کر رہی تھیں۔ اس طرح ان نئی ریاستوں کے شہر تجارت اور صنعت وحرفت کے اہم مرکز بن

گئے ۔لکھنؤ، حیدرآباد، سرنگاپٹم ان میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

اسطرح ان نوتعمیر ریاستیوں کے تجارت میں دلچسپی لینے کی وجہ سے ہندوستان کے معاشی ڈھانچے میں تبدیلی ہورہی تھی۔ان خودمختار ریاستوں میں معیشت کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی تھیں اس کے علاوہ شعراء، ادیبوں، موسیقار اور سبھی اہلِ فن کی سرپرستی بھی یہ ریاستیں کررہی تھیں اس کے پیشِ نظر مقامی زبانوں اور مقامی فن کو فروغ مل رہا تھا کیونکہ ہوسکتا تھا اگر چہ مغل سلطنت کی مرکزیت زوال پذیر نہیں ہوتی تو شاید مقامی زبانیں نہیں ابھر سکتی تھیں۔ کیونکہ اب تک مغل دربار صرف فارسی زبانوں کی سرپرستی کرتا آیا تھا اور اسی وجہ سے دربار میں مقامی فنکاروں کی رسائی مشکل تھی۔جیسا کہ اس عہد کی سیاسی کشمکش کے باعث زیادہ تر اردو شعراء جیسے مصحفیؔ، انشاؔ، سوداؔ، اور میر تقی میرؔ وغیرہ شعراء نے دلی کو چھوڑ کر فرخ آباد، لکھنؤ، فیض آباد و عظیم آباد وغیرہ ریاستوں میں پناہ لی۔جہاں دلی کبھی علم وفنون کا مرکز بنی ہوئی تھی وہیں دوسری طرف اب یہ ریاستیں علم وفنون کی سرپرستی کررہی تھیں۔

ان ریاستوں میں ۱۷۳۹ تک پرانا مغلیہ نظام پہلے جیسا چلتا رہا۔صرف اس کے اختیارات مقامی حکمرانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔

اس کے علاوہ سیاسی حالات کے ابتر ہونے کی وجہ سے معاشرے کی تمام اخلاقی قدریں بھی ختم ہورہی تھیں اور پورا معاشرہ مع بااقتدار طبقے کے انحطاط پذیر ہورہا تھا۔کیونکہ زوال کا اثر صرف بادشاہ یا امراء تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کا اثر پورے معاشرے پر پڑ رہا تھا۔معاشرے میں تحفظ نہ رہنے کی وجہ سے رشوت خوری و بدعنوانیت بڑھ رہی تھی۔اس طرح زوال عہد وسطی کے معاشرتی وتہذیبی زوال پذیر ہونے کا ایک حصہ بھی ہے جس کی عکاسی اٹھارویں صدی کے شعراء کے کلام میں نمایاں ہے۔

☆☆☆

فرہنگ

انکلے	اندازہ، قیاس
امرد	نابالغ لڑکا
امساک	قحط
اَفگار	زخمی، مجروح
انجم	نجم کی جمع، ستارے
احدی	سست، کاہل
آنجھواں	آنسو
اسفل	انتہا ذلیل
بھبھوت	وہ راکھ جو جوگی سنیاسی اپنے بدن پر ملتے ہیں
بھنڈ	کسی چیز کا سوکھا ہوا ڈلا
بھاجڑ	بھاگڑ
خفتہ	غافل، سویا ہوا
حزیں	غمگین
خس	سوکھی گھاس
خروس	مرغ
خاوری	سورج سے منسوب
خم خانہ	شراب خانہ

خزینا	خزانہ
دول	دولت کی جمع، بہت سی سلطنتیں
رخت	سازوسامان
رن	میدان جنگ
رکت	خون
رمّال	نجومی
زبس	بہت
سمند	گھوڑا
شغال	گیدڑ
شوم	کنجوس، منحوس
شومی	بدبختی
طویلہ	اصطبل
فرو	تحت، زیر
کاہ	سوکھی گھاس
کِشت	کھیتی باڑی
گاہ	وقت، مقام
لوہو	خون
مورچھل	مور کے پروں کا پنکھا

کتابیات

کتابیات (Bibliography)

بنیادی ماخذ (Primary Sources)

(الف) تاریخی ماخذ:

خافی خاں : ''منتخب اللباب''، حصہ چہارم، مترجم محمود احمد فاروقی، کراچی، ۱۹۶۳

درگاہ قلی خاں : ''مرقع دہلی'' مرتبہ ومترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳

ڈبلو، ایچ، مورلینڈ : ''اکبر سے اورنگ زیب تک'' مترجم جمال محمد صدیقی، دہلی، ۱۹۸۱

سید معین الحق : ''اخبار رنگین''، کراچی، ۱۹۶۲

شاہ ولی اللہ : ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات''، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی دہلی، ۱۹۶۹

شاہ ولی اللہ : ''حجۃ اللہ البالغہ''، مترجم مولانا عبدالرحیم، لاہور، ۱۹۶۲

صمصام الدین شاہنواز خاں : ''ماثر الامراء''، مترجم مولوی خالد حسن قادری، لاہور، ۱۹۶۳

غلام حسین طباطبائی : ''سیر المتاخرین''، مترجم یونس احمد، کراچی، ۱۹۶۸

محمد ساقی مستعد خاں : ماثرِ عالمگیری، مترجمہ محمد فدا علی طالب، کراچی، ۱۹۶۶

محمد حسن قتیل : 'ہفت تماشہ' مترجم ڈاکٹر محمد عمر، دہلی، ۱۹۶۸

محمد ظہیر الدین اظفری : ''واقعاتِ اظفری''، مترجم عبدالستار، مدراس، ۱۹۳۷

(ب) اردو شاعری کے بنیادی ماخذ:

جعفر علی حسرت : ''کلیاتِ حسرت''، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء

شیخ ظہورالدین حاتم : ''دیوان زادہ'' مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵ء

غلام ہمدانی مصحفی : ''دیوانِ مصحفی''، مرتبہ و منتخبہ اسیر لکھنوی و امیر مینائی، پٹنہ، ۱۹۹۰ء

فائز : ''دیوانِ فائز''، مرتبہ سیّد مسعود حسن رضوی، دہلی، ۱۹۴۶ء

قائم چاندپوری : ''دیوانِ قائم''، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳ء

میر جعفر زٹلی : ''کلیاتِ جعفر زٹلی''، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

میر تقی میر : ''کلیاتِ میر''، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء

میر تقی میر : میر کی آپ بیتی (ذکر میر) مترجم نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء

محمد شاکر ناجی : ''دیوانِ شاکر ناجی''، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق، دہلی، ۱۹۶۸ء

محمد رفیع سودا : کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء

میر حسن : ''مثنویاتِ میر حسن''، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۵ء

: ''مثنوی سحرالبیان''، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء

نظیر اکبرآبادی : ''کلیاتِ نظیر اکبرآبادی''، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

II- ثانوی ماخذ Secondary Sources

(الف) اُردو ماخذ (ثانوی)

اعجاز حسین : ''اردو شاعری کا سماجی پس منظر''، الہ آباد، ۱۹۶۸ء

ابواللیث صدیقی : ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری''، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

بشیرالدین احمد علوی : ''جعفر علی حسرت سوانح اور کلام'' لاہور، ۱۹۸۵ء

ثناءالحق مجاز : ''میر و سودا کا دور اردو شاعری کا عہد زریں'' کراچی، ۱۹۶۵ء

جمیل جالبی : ''تاریخ ادب اردو''، دہلی، ۱۹۸۲
خلیق انجم : ''مرزا محمد رفیع سودا''، دہلی، ۱۹۶۶
رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو''، مترجمہ محمد عسکری، لکھنو، ۱۹۵۲
رشید حسن خاں : زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی)، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۲۰۰۳
سید طلعت حسین نقوی : ''نظیر اکبرآبادی''، فیض آباد، ۱۹۹۰
شمس الرحمٰن فاروقی : ''شعر شور انگیز''، حصہ اول، دہلی، ۱۹۹۰
محمد حسن : ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر''، علی گڑھ، ۱۹۶۴
محمد حسین آزاد : ''آب حیات'' الہ آباد، ۱۹۶۷
نور الحسن ہاشمی : ''دلّی کا دبستانِ شاعری'' لکھنؤ، ۱۹۷۱
نثار احمد فاروقی : ''میر تقی میر''، دہلی، ۱۹۸۵
نثار احمد فاروقی : ''تلاش میر''، دہلی، ۱۹۷۴
نعیم احمد : ''شہر آشوب'' دہلی، ۱۹۶۸
یوسف حسین : ''اردو غزل''، دہلی، ۱۹۵۲

(ب) تاریخی ماخذ (ثانوی)

ابن حسن : ''سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظامِ حکومت''، مترجم آئی. اے. ظلّی دہلی، ۱۹۸۲
بشیر الدین احمد : ''واقعات دار الحکومت دہلی'' حصہ اول،، دہلی، ۱۹۱۹
تاراچند : ''تاریخ تحریکِ آزادی'' جلد اول، مترجم جمال محمد صدیقی، دہلی، ۱۹۷۷

خلیق احمد نظامی : ''تاریخ مشائخ چشت''، دہلی، مئی ۱۹۵۳

ستیش چندر : ''مغل دربار کی گروہ بندیاں اوران کی سیاست''، مترجم محمد قاسم صدیقی، دہلی، ۱۹۸۷

علامہ مناظر احسن گیلانی : ''تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ''، لائل پور، پاکستان، ۱۹۶۵

عرفان حبیب : ''مغل ہندوستان کا طریق زراعت''، مترجم جمال محمد صدیقی، دہلی، ۱۹۷۷

محمد عمر : ''اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد''، دہلی، ۱۹۷۳

محمد اطہر علی : ''اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء''، مترجم امین الدین، دہلی، ۱۹۸۵

محمد حبیب : ''سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ''، مترجم سید جمال الدین، ۱۹۷۹

مبارک علی : ''مغلیہ سلطنت کا آخری عہد، لاہور، ۱۹۹۴

نجم الغنی : ''تاریخ ریاست حیدرآباد دکن (حصہ اول)، لکھنؤ، ۱۹۳۰

III : Secondary Sources : English

(1) Andre Wink,Land and Sovereignty in India-Agrarian Society and Politics under the Eighteenth century Maratha Svarajya, Cambridge,1986.

(2) Burton stein,Peasant state and society in Medieval South India,Delhi,1980.

(3) C.A.Bayly,Rulers,Townsmen and Bazars: North Indian Society in the Age of British Expansion, 1770-1870,Cambridge,1983.

(4) Centwell Smith, Lower Class Uprisings in Mughal Empire,Islamic Culture,1946.

(5) Chetan Singh, Region and Empire: Punjab in the seventeenth century,New Delhi,1991.

(6) Ishwari Prasad,The Mughal Empire. Allahabad,1974.
(7) J.F. Richards, The Mughal Empire. Cambridge University,Press. 1994.
(8) J.N. sarkar, "The Fall of Mughal Empire.Calcutta,1938.
(9) J.N. Sarkar, " History of Aurangzeb", 5 vols, Calcutta, reprint, Bombay. 1971.
(10) K.A. Nizami, "Studies in Medieval Indian History and Culture, Delhi, 1966.
(11) M. Faruqi, "Aunrangzeb And His Time. Bombay, 1935.
(12) M. Alam, "The Crisis of Empire in Mughal North India,Awadh and Punjab,1707-1748, Delhi, 1986.
(13) M.N.Pearson,"Merchants and Rulers in Gujrat.California,1976.
(14) M.Athar Ali,"The Mughal Nobility under Aurangzeb,Bombay,1966.
(15) M. Mujeeb, Indian Muslims, London, 1967.
(16) Mohammad Umar, Muslim Society in Northern India During the Eighteenth Century. Aligarh. 1998.
(17) Percival Spear, Twilight of The Mughals. Delhi, 1969 (Reprint)
(18) R.P.Tripathi,"Rise and Fall of the Mughal Empire, Allahabad,1977.
(19) Ram Prasad Khosla." Mughal Kingship and Nobility,Delhi,1934.
(20) Ralph Russel & Khurshid-ul-Islam." Three Mughal Poets, London, 1969.
(21) Satish Chardra, " Medieval India Society. The Jagirdari Crisis And the Village, Delhi. 1982.
(22) S. R. Sharma, The Religious Policy of The Mughal Emperors, Delhi. 1961.
(23) Saiyid Athar Abbas Rizvi. Shah Wali-Allah and His Times, Australia. 1980.
(24) W. Irvine, "The Later Moghuls", reprint, New Delhi, 1971.
(25) Zahir-uddin Malik, "The Reign of Muhammad Shah,Bombay,1977.

IV- Articles

(26) K.M Ashraf."Presidential Address to the Medieval Indian Section,PIHC,23rd session, Aligarh,1960.
(27) Karen Leonard. 'The "Great Firm" Theory of the Decline of the Mughal Empire" article reproduced in "The Mughal State" ed. M. Alam & Sunjay Subrahmanyam, Delhi, 1998.

(28) M.Athar Ali," The Passing of Empire: The Mughal case,Modem Asian Studies,vol-9,No.3,1975.

(29) M. Athar Ali, "The Mughal Polity - A Critique of Revisionist" Approaches, Published in the Proceedings of 52th Session, Indian History Congress, 1991-92.

(30) M.N.Pearson," Political Participation in Mughal India, IESHR, Vol-IXth, No.2, June 1972.

(31) Muhammad Umar, Literature of a Decling Empire" Urdu Poetry in the 18th Century, Article published in the proceeding 52th session, Indian History Congress, 1991-92.

(32) Philip C Calkins, "The Formation of a Regionally Oriented Ruling Group in Bengal; Journal of Asian Studies. Vol.XXIX No. 4, Aug,1970.

(33) S.NurulHassan,"Zamindars Under the Mughals",Land Control and Social Structure in Indian History, ed. R.E. Frykenberg, Madison,1969.

(34) Satish Chandra, "Review of the Crisis of the Jagirdari System" article reproduced in "The Mughal State" ed. M. Alam & Sunjay Subrahmanyam, Delhi, 1998.

☆☆☆